اشتیاق احمد

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشتیاق احمد کی زندگی کا تیسرا ناول ۱۵

شیشے کا بکس

اشتیاق احمد

حدیث شریف :

ابو مالک اشعری رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا :

طہارت اور پاکیزگی ایمان کا نصف حصہ ہے۔ (ابوداؤد)

تشریح :

اسلام صرف روحانی اور اخلاقی پاکیزگی کی ہی تعلیم نہیں دیتا۔ ظاہری صفائی پاکیزگی اور سلیقہ شعاری کی بھی تاکید کی گئی ہے۔اسی لیے صفائی کو نصف ایمان قرار دیا گیا۔

ناول پڑھنے سے پہلے ،

یہ دیکھیں کہ

- ○ یہ وقت نماز کا تو نہیں؟
- ○ آپ کو سکول کا کوئی کام تو نہیں کرنا۔ کل آپ کا کوئی ٹسٹ یا امتحان تو نہیں؟
- ○ آپ کے ذمے گھر والوں نے کوئی کام تو نہیں لگا رکھا۔
- ○ آپ نے کسی کو وقت تو نہیں دے رکھا؟

اگر ان باتوں میں سے کوئی ایک بھی بات ہو تو ناول الماری میں رکھ دیں، پہلے نماز اور دوسرے کاموں سے فارغ ہولیں، پھر ناول پڑھیں۔

مخلص :
اشتیاق احمد

بار اول : یکم اگست ۱۹۸۳ء
طابع : اشتیاق احمد
مطبع : [illegible]
خوشنویس : [illegible]
سرورق : محمد جاوید چغتائی لاہور
طباعت سرورق : [illegible]
قیمت : چھ روپے

اشتیاق پبلیکیشنز، راجپوت مارکیٹ، اردو بازار لاہور

دو باتیں

یہ لیجیے، میری زندگی کا تیسرا ناول شیشے کا بکس پڑھیے۔ دس سال پہلے یہ ناول دھماکا خیز ثابت ہوا تھا۔ بچوں نے میرا نام لے کر ناول طلب کرنا اور پڑھنا شروع کیے تھے۔۔۔ محمود، فاروق اور فرزانہ کی شوخیاں عروج پر نظر آئیں گی۔

دس سال پہلے یہ ناول شیخ غلام علی اینڈ سنز کو لکھ کر دیا تھا۔۔۔ اب اللہ کی مہربانی سے اس کے حقوق قانون کی رو سے مجھے مل گئے ہیں۔۔۔ لہذا اشتیاق پبلی کیشنز سے شائع کیا جا رہا ہے۔

ناول کیسا ہے۔۔۔ آج کے ناولوں میں اور اس میں آپ کیا فرق محسوس کرتے ہیں، یہ آپ کے خطوط بتائیں گے، جن کا ان دنوں یوں بھی تانتا بندھا ہے۔ شکریہ!

وہ چیز

نیشنل پارک میں ایک شخص تیز رفتاری سے دوڑتا ہوا داخل ہوا۔ پارک کے گیٹ کے پاس ہی محمود اور فاروق بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ وہ شخص ایک سیکنڈ کے لیے ان کے پاس رکا اور کوئی چیز گراتا ہوا تیزی سے آگے بڑھ گیا۔۔۔ دونوں نے حیران ہو کر اس بدحواس آدمی کو دیکھا اور پھر زمین پر پڑی اس چیز کو جو چمک رہی تھی۔

عین اسی وقت دو لمبے تڑنگے نوجوان دوڑتے ہوئے اندر داخل ہوئے اور اس کی طرف لپکے۔۔۔ محمود نے تیزی سے اس پر اپنا بستہ رکھ دیا۔۔۔ آگے پیچھے دوڑتے ہوئے وہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔

"یہ کیا چکر ہے؟" فاروق بولا۔

"خدا جانے۔۔۔ کیا میں بستہ اٹھا کر دیکھوں؟"

"میرا خیال ہے اسے بستے میں رکھ کر یہاں سے اٹھ چلو، ہو سکتا ہے وہ اسے پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں اور وہ ان دونوں کو یہاں

لے آئے۔ ظاہر ہے کہ اس شخص کو اپنی جان سے زیادہ یہ چیز عزیز نہیں ہوگی۔" فاروق نے تجویز پیش کی۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" محمود نے کہا۔

دوسرے ہی لمحے محمود اس چیز کو نیچے ہی نیچے اٹھا کر بستے میں رکھ چکا تھا۔ پھر وہ اٹھے اور پارک سے نکل آئے۔

"کیا ہے یہ؟" فاروق نے پوچھا۔

"شیشے کا ایک مستطیل ٹکڑا۔" محمود نے بتایا۔

"کہیں ہیرا تو نہیں ہے؟" فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

"اتنا بڑا؟ نہیں، یہ ہیرا تو نہیں ہو سکتا۔"

"تو ایک معمولی سے شیشے کے ٹکڑے کے لیے وہ اس کا پیچھا موت کے فرشتوں کی طرح کیوں کر رہے تھے؟"

"یہ تو وہی جانیں۔" محمود بولا۔

"کہیں ہم پھر کسی چکر میں پھنسنے والے تو نہیں؟"

"لگتا تو ایسا ہی ہے۔"

"ابا جان سخت ناراض ہوں گے۔ ان کا خیال ہے کہ ہم پڑھائی کی طرف تو کوئی توجہ دیتے نہیں اور ادھر ادھر اپنی ٹانگ اڑاتے رہتے ہیں۔"

"تم تو جانتے ہی ہو کہ ہم خود اپنی ٹانگ نہیں اڑاتے، بلکہ ٹانگ خود بخود اڑ جاتی ہے۔ اب آج کی مثال ہی لے لو۔ کیا اس میں

ہماری کسی کوشش کو دخل تھا۔ خود بخود ایک شخص یہ عجیب سی چیز گرا کر چلا گیا۔"

"یہ تو ٹھیک ہے، مگر—" فاروق کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"تم فکر نہ کرو، ہم اس کے بارے میں ابا جان کو بتائیں گے ہی نہیں۔" محمود نے اسے تسلی دی۔

"ہوں۔"

شام کے سوا چار بج رہے تھے۔ سورج مغرب کی طرف اپنا سفر کر رہا تھا۔ بہار کے دن تھے۔ ان خوش گوار دنوں میں ہر روز شام کو وہ نیشنل پارک میں اپنی کورس کی کتابیں پڑھنے آتے تھے، لیکن ان کے والد انسپکٹر جمشید نے انہیں صرف پانچ بجے تک گھر سے باہر رہنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ وہ ہر روز ٹھیک پانچ بجے گھر پہنچ جاتے تھے، جہاں ان کے والد، والدہ اور فرزانہ انہیں چائے کی میز پر تیار ملتے۔

"آج ہم وقت سے پہلے ہی گھر جا رہے ہیں۔ ابا جان اس کی وجہ ضرور پوچھیں گے۔" فاروق بول اٹھا۔

"ہوں— بھئی کہہ دیں گے کہ آج کام بہت تھوڑا تھا۔" محمود نے کہا۔

"گویا جھوٹ بولیں گے۔" فاروق نے اعتراض کیا۔

"تو پھر انہیں سچ سچ بتا دیں گے کہ آج پھر ہم....."

"نہیں نہیں، وہ غصے میں ہوں گے۔ ابھی ہم انہیں کچھ نہیں بتائیں گے۔"

"نہ تم اس طرح چین لیتے ہو نہ اس طرح۔"

"عجیب مصیبت ہے۔"

"خیر دیکھا جائے گا۔ وقت اور حالات کے مطابق بات کر لیں گے۔"

"یہ ٹھیک ہے۔"

دونوں اس بات پر رضامند ہو کر ایک ساتھ قدم اٹھانے لگے۔

O

دفتر سے چلتے وقت میز کی دراز اور ادھر ادھر کی چیزوں کا جائزہ لینا انسپکٹر جمشید کی عادت تھی۔ آج بھی ٹھیک پونے چار بجے انہوں نے میز کی دراز کھولی تو وہ چونک اٹھے۔ گھبراہٹ کے عالم میں چپراسی کو آواز دی:

"رحیم!"

"یس سر۔"

"میز کی دراز کو تم نے کھولا تھا؟" انہوں نے تیز نظریں اس پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"میز کی دراز، جی نہیں تو۔ اس کی چابی تو ہر وقت آپ کے پاس رہتی ہے۔"

"میری غیر موجودگی میں کوئی مجھ سے ملنے آیا تھا؟"

"نہیں جناب، کوئی بھی نہیں۔" رحیم نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"عجیب بات ہے۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"بات کیا ہے سر؟"

"اس میز کی دراز میں میں نے دو تین دن پہلے ایک بہت ہی اہم چیز رکھی تھی، اور اب وہ غائب ہے۔"

"غائب ہے؟" رحیم کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں، کل جس وقت میں گیا تھا، تو وہ یہیں موجود تھی۔" انہوں نے بتایا۔

"اور آج دن میں؟" رحیم نے پوچھا۔

"دن میں میں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔"

"وہ کیا چیز تھی سر؟"

"شیشے کا ایک مستطیل ٹکڑا۔"

"نہیں سر، میں نے میز کی دراز کو ہاتھ بھی نہیں لگایا اور نہ ہی میرے ہوتے ہوئے یہاں کوئی آیا۔"

"تعجب ہے، پھر آخر وہ کہاں چلی گئی؟" انسپکٹر جمشید کے چہرے پر

فکر کے بادل گہرے ہوتے جا رہے تھے۔

"کیا وہ اتنی ہی اہم چیز ہے سر؟" رحیم نے پوچھا۔

"بہت زیادہ — شاید تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ کل آپ اسے گھر لے گئے ہوں۔"

"ناممکن، مجھے یقین ہے کہ وہ دراز میں ہی تھی۔"

"پھر بھی گھر میں دیکھ لینے میں حرج ہی کیا ہے۔ بعض اوقات بے خیالی میں نہ جانے کیا کچھ ہو جاتا ہے۔"

"اچھا، میں گھر میں بھی دیکھے لیتا ہوں — تم جانا نہیں، میرے فون کا انتظار کرنا۔"

"جی بہتر۔"

انسپکٹر جمشید بدحواسی کے عالم میں باہر نکلے۔ یہاں ان کی موٹر سائیکل تیار کھڑی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ طوفانی رفتار سے گھر کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ ٹھیک چار بجے وہ گھر پہنچ گئے۔ بیگم جمشید ان کا انتظار کر رہی تھیں۔

"کیا بات ہے، آپ بہت گھبرائے ہوئے ہیں؟"

"ایک بہت ہی اہم چیز گم ہو گئی ہے۔"

"خدا خیر کرے، ایسی کیا چیز گم ہو گئی ہے؟"

"شیشے کا ایک مستطیل ٹکڑا۔" انہوں نے بتایا۔

"ارے، آپ شیشے کے ایک ٹکڑے کے لیے پریشان ہو رہے ہیں۔"

بیگم جمشید حیران رہ گئیں۔

"تمہیں نہیں معلوم بیگم، وہ بہت ہی اہم چیز ہے۔ ٹھہرو، پہلے میں اسے گھر میں دیکھ لوں۔"

انہوں نے گھر کا چپا چپا چھان مارا، لیکن شیشے کا ٹکڑا انہیں کہیں نہ ملا۔ ان کی پریشانی میں ہر لمحے اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔

"نہیں، میری یادداشت بالکل ٹھیک ہے، وہ ٹکڑا دفتر کی میز کی دراز میں تھا۔ وہ وہیں سے چرایا گیا، ہاں میز کی دراز سے ہی گم ہوا ہے۔" وہ بڑبڑا رہے تھے اور بیگم جمشید انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔

پھر وہ ٹیلی فون کرنے کی غرض سے ساتھ والی کوٹھی میں گئے۔ بیگم بھی ان کے پیچھے تھیں۔

"کچھ بتائیے بھی تو — آخر ماجرا کیا ہے۔" انہوں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"تھوڑی دیر خاموش رہو بیگم — میں سب کچھ بتا دوں گا۔"

اپنے پڑوسی کے گھر سے انہوں نے دفتر فون کیا، لیکن دوسری طرف سے کسی نے ریسیور نہ اٹھایا — بار بار نمبر ڈائل کرنے کے بعد آخر وہ تنگ آ گئے۔

"کمال ہے، میں نے رحیم سے کہا تھا کہ میرے فون کا انتظار کرنا، پھر وہ کہاں چلا گیا — مجھے خود ہی جا کر دیکھنا چاہیے۔" انہوں نے اپنے

آپ سے کہا۔

وہ تیزی سے باہر نکلے اور موٹر سائیکل کی طرف بڑھے، پھر بیگم سے بولے:

"میں ابھی واپس آتا ہوں۔ تم اس ٹکڑے کا کسی سے ذکر نہ کرنا۔"

"اچھا۔"

بیگم جمشید انہیں موٹر سائیکل پر طوفانی رفتار سے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر فکر اور حیرت کے ملے جلے اثرات تھے۔ انہوں نے آج تک انہیں اس حد تک فکر مند نہیں دیکھا تھا۔

○

وہ اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے نیشنل پارک کے عقبی دروازے سے باہر نکل گئے۔ ان کے درمیان اب بھی کافی فاصلہ تھا۔ اگلا آدمی بھی جان توڑ کر بھاگ رہا تھا۔ دوڑتے۔ دوڑتے اب وہ ایک سنسان سڑک پر نکل آئے تھے۔ درمیانی فاصلہ اب بھی اتنا ہی تھا۔ تعاقب کرنے والے یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ وہ اس طرح دوڑتے ہوئے اسے کبھی نہ پکڑ سکیں گے۔ آخر ان میں سے ایک نے جیب سے کوئی چیز نکالی اور اگلے آدمی پر کھینچ ماری۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور دوسرے ہی

لمحے وہ زمین پر گر چکا تھا۔

جلد ہی وہ اس تک پہنچ گئے۔ اگلے آدمی کی پنڈلی میں ایک چاقو پیوست تھا اور خون بہہ بہہ کر زمین کو سرخ کر رہا تھا۔

"اسے اٹھا کر سڑک سے دور درختوں کے جھنڈ میں لے چلنا چاہیے۔" ایک بولا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو شوکت۔ سڑک پر کسی وقت بھی کوئی گاڑی آ سکتی ہے۔" دوسرے نے کہا۔

دونوں نے اسے ٹانگوں اور بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور درختوں کے جھنڈ میں لے آئے۔

"اب اس کی تلاشی لو، اور وہ ٹکڑا برآمد کر لو۔" شوکت نے کہا۔

دوسرا تلاشی لینے لگا، لیکن اس کی جیبوں سے وہ ٹکڑا برآمد نہیں ہوا۔

"وہ ٹکڑا کہاں ہے؟" اس نے زخمی نوجوان سے پوچھا۔

"میرے پاس نہیں ہے۔" زخمی نے کراہ کر جواب دیا۔

"یہی تو ہم پوچھ رہے ہیں، وہ کہاں ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"تنویر، یہ ایسے نہیں بتائے گا۔" شوکت نے کہا اور ساتھ ہی چاقو اس کی پنڈلی سے نکال لیا، پھر بولا:

"دیکھو دوست، اگر تم نے سیدھی طرح نہ بتایا تو یہ چاقو تمہاری دوسری

پنڈلی میں بھی اتر جائے گا — ہاں، شاباش، اب بتا ہی دو۔"

"مجھے نہیں معلوم۔"

"اچھا، تو یہ لو۔" شوکت نے چاقو کی نوک اس کی پنڈلی میں اتار دی۔ زخمی نوجوان درد سے چلّا اٹھا:

"اُف، مر گیا۔"

"ابھی کہاں مرے ہو — ابھی تو یہ پورا چاقو تمہارے گوشت میں اتار دیا جائے گا، پھر بھی نہ بتایا تو اسی چاقو سے ......"

"نہیں نہیں، آگے کچھ نہ کہو، میں بتاتا ہوں۔" زخمی خوف سے لرز رہا تھا۔

"بہت خوب، اب آئے ہو نا سیدھے راستے پر — ہاں تو بتاؤ۔" شوکت ہنسا۔

"جب میں نیشنل پارک میں داخل ہوا تو ٹکڑا میرے پاس تھا۔ تم دونوں میرے پیچھے تھے — دروازے کے پاس ہی دو لڑکے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ وہ ٹکڑا میں نے ان کے پاس گرا دیا تھا۔"

"تم جھوٹ بک رہے ہو۔"

"خدا کی قسم، میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔"

"اگر یہ غلط ہوا تو ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے — چلو ہمارے ساتھ۔"

"لیکن میں کیسے چل سکتا ہوں۔" زخمی نے کہا۔

"ہوں، اچھا ٹھیک ہے۔ میں پارک میں جا کر دیکھتا ہوں۔ تنویر، تم اتنی دیر میں اس کی پنڈلیوں پر کوئی رومال وغیرہ باندھ دو۔" شوکت نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے ہی لمحے وہ نیشنل پارک کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اس کا ساتھی تنویر زخمی کی پٹی کرنے لگا — تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی، لیکن چہرے پر مایوسی اور غصہ تھا۔

"ہیلو شوکت، کیا رہا، کیا مل گیا؟"

"نہیں تنویر، وہاں کوئی لڑکا نہیں ہے۔" شوکت نے جواب دیا —

"تو وہ چلے گئے ہوں گے۔" زخمی گھبرا گیا —

"یا پھر تم ہی جھوٹ بول رہے ہو گے۔"

"جو حقیقت تھی، میں بتا چکا ہوں — اب وہ لڑکے کہاں چلے گئے، میں کیا بتا سکتا ہوں۔"

"خیر، اب ایک ہی صورت ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ تم ہمارے ساتھ چلو اور جب تک وہ ٹکڑا ہمیں نہیں مل جاتا، تم ہمارے مہمان رہو گے۔"

"ہو سکتا ہے، وہ دونوں لڑکے کل پھر پارک میں آئیں۔ تمہیں ان سے مل کر میرے سچ جھوٹ کا پتا چل جائے گا۔" زخمی کراہتے ہوئے بولا —

"یہ ٹھیک ہے، لیکن بہرحال تمہیں ہمارا مہمان تو بننا ہی پڑے گا، چلو اٹھو۔"

زخمی کراہتا ہوا اُٹھا۔ دونوں اسے سہارا دے کر سڑک کے پاس پہنچے، جلد ہی انہیں ایک ٹیکسی مل گئی۔

شیشے کا ٹکڑا

محمود اور فاروق گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ ان کی امی شدید بے چینی کے عالم میں ادھر سے ادھر ٹہل رہی ہیں۔

"السلام علیکم امی جان۔" دونوں بیک وقت بولے۔

"وعلیکم السلام، بیٹا، تم آ گئے۔"

"جی، امی جان — کیا بات ہے، آپ بہت پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔" محمود نے کہا۔

"کچھ نہیں بیٹا۔"

"نہیں امی جان، کچھ نہ کچھ بات تو ہے۔" محمود بولا۔

"ابا جان ابھی تک نہیں آئے؟" فاروق نے پوچھا

"آئے تھے، پھر چلے گئے۔" انہوں نے بتایا۔

"کیوں؟"

"کوئی کام ہو گا۔" ان کی آواز سے پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔

"امّی جان" محمود نے کہا۔

"کیا بات ہے بیٹا؟"

"آپ کچھ چھپا رہی ہیں۔ خدا کے لیے بتائیے، کیا بات ہے؟"

"بیٹا، میں تمہیں کچھ نہیں بتا سکتی۔ تمہارے ابّا جان منع کر گئے ہیں۔"

"ہوں، تو یہ بات ہے۔" دونوں سوچ میں ڈوب گئے۔

"جس وقت وہ آئے، ان کی کیا حالت تھی، کیا وہ پرسکون تھے۔" محمود نے بالکل کسی پولیس انسپکٹر کی طرح پوچھا۔

"وہ بہت پریشان تھے۔"

"اس کا مطلب ہے، دفتر میں کوئی بات ہوئی ہے۔" فاروق نے نتیجہ اخذ کیا۔

"انہوں نے آکر کیا کیا؟" محمود نے ایک اور سوال کیا۔

"وہ کوئی چیز تلاش کرنے لگے۔" بیگم جمشید نے محتاط لہجے میں کہا۔

وہ جانتی تھیں کہ دونوں بچے بہت کھوجی طبیعت رکھتے ہیں۔

"کیا وہ چیز انہیں مل گئی؟" اس مرتبہ فاروق نے سوال کیا۔

"نہیں۔"

"پھر وہ فوراً ہی واپس چلے گئے؟" محمود نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"انہوں نے گھر میں کچھ کھایا پیا؟"

"نہیں۔" بیگم جمشید بھی بالکل اسی انداز میں جواب دے رہی تھیں جیسے کوئی پولیس افسر ان سے سوال کر رہا ہو۔

"امّی جان، آپ نے ہمیں اصل بات نہیں بتائی، لیکن ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ابّا جان کی کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ یہ چیز دفتر میں ہی گم ہوئی ہے، پھر بھی وہ اس خیال سے کہ شاید وہ بھول گئے ہوں، گھر میں بھی دیکھنے کے لیے آئے، وہ چیز انہیں یہاں بھی نہیں ملی، اس لیے وہ دوبارا دفتر میں دیکھنے گئے ہیں۔ کہیے، یہی بات ہے نا۔" محمود خاموش ہو کر اپنی امّی کو دیکھنے لگا۔

"ہاں بیٹا، یہی بات ہے۔"

"وہ کیا چیز ہے امّی جان؟"

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی۔"

"اچھا خیر، ابّا جان ہی آکر بتائیں گے۔ یہ فرزانہ نظر نہیں آ رہی، کیا اپنے کمرے میں ہے؟"

"نہیں۔ کسی سہیلی کے ہاں گئی ہے۔" بیگم جمشید کی آواز بھی ہوئی تھی۔

○

انسپکٹر جمشید طوفانی رفتار سے موٹر سائیکل چلاتے ہوئے ایک بار پھر دفتر

پہنچے — یہاں رحیم کا دُور دُور تک پتا نہ تھا۔ انہوں نے پوری عمارت کا ایک چکر لگایا، لیکن رحیم انہیں کہیں نظر نہیں آیا — آخر کار وہ عمارت کے چوکیدار کے پاس گئے — چوکیدار نے چونک کر انہیں دیکھا اور کھڑا ہو گیا۔

"سلام صاحب، آپ اس وقت یہاں؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہوں، رحیم کا کچھ پتا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی صاحب، آپ کے جانے کے فوراً بعد چلا گیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"فوراً بعد؟"

"جی ہاں۔"

"تم جانتے ہو، وہ کہاں رہتا ہے؟"

"معلوم ہے صاحب جی۔"

"تو بتاؤ۔" انہوں نے بے چینی سے کہا۔

"وہ سلطان آباد میں مکان نمبر ۲۱۹ میں رہتا ہے۔ مکان کرائے کا ہے۔"

"اچھا شکریہ، یہ کچی آبادی ہے نا؟"

"جی ہاں۔"

وہ تیزی سے پلٹے — موٹر سائیکل سٹارٹ کی اور سلطان آباد کی

طرف روانہ ہو گئے — وہاں پہنچ کر مکان نمبر ۲۱۹ کو تلاش کرنے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی — انہوں نے دروازے پر دو بار دستک دی — تیسری مرتبہ انہوں نے دروازے کو دھکیلا — دروازہ کھلتا چلا گیا — وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئے — شام کا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا — مکان اندر سے نیم تاریک تھا — انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن کوئی بجلی کا بلب دکھائی نہ دیا، مکان صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا اور اس کمرے میں ایک چارپائی اور چند ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ مایوس ہو کر وہ باہر نکل آئے۔

"کیا بات ہے جناب؟" وہ چونک اٹھے، ایک بوڑھا آدمی ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"کیا رحیم یہیں رہتا ہے؟"

"جی ہاں۔" بوڑھے نے جواب دیا۔

"وہ ابھی تک واپس نہیں آیا؟"

"جی نہیں، میں کمرے کا مالک ہوں — اس نے یہ کمرہ کرائے پر لیا ہوا ہے۔" بوڑھے نے بتایا۔

"اوہ، کیا آپ کو معلوم ہے کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"یہاں وہ کتنے عرصے سے رہ رہا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"چھ سال سے۔"

"چھ سال سے۔" وہ بڑبڑائے۔

"اچھا شکریہ۔"

واپسی پر انسپکٹر جمشید کے چہرے پر فکر کے آثار تھے۔ آج انہیں زبردست ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ سوچ میں کھوئے ہوئے وہ موٹر سائیکل پر آہستہ رفتار سے گھر کی طرف چل پڑے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ افسرانِ بالا جب وہ شیشے کا ٹکڑا ان سے طلب کریں گے تو ان کا کیا جواب ہو گا۔ دفعتاً ایک ترکیب سوجھ گئی، اور کچھ اطمینان کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی موٹر سائیکل کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ سوچ رہے تھے: "ٹھیک ہے، میں صبح ہی افسرانِ بالا کو رپورٹ کر دوں گا کہ میرا چپراسی رحیم اس ٹکڑے سمیت غائب ہے۔ ظاہر ہے کہ اس گڑبڑ میں اسی کا ہاتھ ہے۔"

جب وہ گھر میں داخل ہوئے تو محمود، فاروق، فرزانہ اور بیگم جمشید ان کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ فرزانہ ابھی ابھی اپنی سہیلی ناہید کے گھر سے لوٹی تھی۔ اسے بھی بیگم جمشید نے اتنا کچھ ہی بتایا تھا، جتنا اپنے دونوں بیٹوں کو۔

"ابا جان آگئے۔" فرزانہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ تینوں بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کیا رہا؟" بیگم نے پوچھا۔

"ناکامی، رحیم دفتر سے غائب ہے۔ وہ ضرور کسی کے ہاتھوں بک

گیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"ابا جان، بات کیا ہے؟" محمود نے پوچھا۔

"بات تمہارے مطلب کی نہیں ہے۔ تم تینوں اپنے کمرے میں جاؤ، آرام کرو، پڑھو یا کھیلو۔"

"پلیز، ابا جان ہمیں بتا دیں۔"

"میں نے کہا نا، تمہارے مطلب کی بات نہیں ہے، چلو، جاؤ۔" انہوں نے کہا۔

مجبوراً تینوں اٹھ کھڑے ہوئے۔ محمود اور فاروق کا کمرہ الگ تھا اور فرزانہ کا کمرہ ان کے کمرے کے سامنے تھا، لیکن اس وقت فرزانہ بھی ان کے کمرے میں ہی چلی آئی۔

"آخر ماجرا کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہم بھی اتنا ہی جانتے ہیں، جتنا کہ تم۔ کوئی بہت ہی اہم چیز ابا جان کی میز کی دراز سے گم ہوگئی ہے اور غالباً اس گمشدگی میں رحیم کا ہاتھ ہے۔"

"تو پھر رحیم کو پکڑنے کا بھی تو کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔" فرزانہ کو اچانک خیال آیا۔

"اوہ ہاں، بالکل ٹھیک۔ ٹھہرو، میں ابا جان کی توجہ اس طرف دلا آؤں، شاید پریشانی میں انہیں خیال نہیں رہا۔" محمود نے کہا اور کمرے سے باہر نکل آیا، لیکن کمرے میں اس کی

والدہ تنہا تھیں۔

"ابا جان کہاں گئے؟"

"شیرازی صاحب کی کوٹھی سے فون کرنے ۔۔۔ تاکہ رحیم کو پکڑا جا سکے۔"

"ٹھیک ہے، ہمیں بھی ابھی یہی خیال آیا تھا۔"

محمود نے کہا اور واپس اپنے کمرے میں چلا آیا ۔۔۔ یہاں تینوں کافی دیر تک تبادلہ خیالات کرتے رہے، لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ اچانک فاروق کو اس شیشے کے ٹکڑے کا خیال آیا۔

"ارے بھئی، وہ تو نکالو ۔۔۔ دیکھیں تو سہی کیا بلا ہے۔"

"ابھی نہیں۔" محمود نے فاروق کو اشارا کیا ۔۔۔ اس کا مطلب تھا کہ فرزانہ کے چلے جانے کے بعد دیکھیں گے ۔۔۔ ان کی ہمیشہ یہی کوشش رہتی تھی کہ فرزانہ کو اپنے کسی معاملے میں شریک نہ کریں، کیونکہ وہ ان سے بازی لے جایا کرتی تھی ۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ترکیبیں سوچنے میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔

"یہ کس 'وہ' کا ذکر ہو رہا ہے۔" وہ چونک اٹھی۔

"کچھ نہیں ۔۔۔ یونہی۔" محمود نے اسے ٹال دیا۔

"اچھا، میں تو جا کر سوتی ہوں۔" فرزانہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"جھوٹی کہیں کی، سیدھی طرح کیوں نہیں کہتیں کہ جا کر بچوں کا ناول پڑھوں گی۔"

"ناول، کون سا ناول؟" فرزانہ نے معصومانہ انداز میں کہا۔

"بس بس ۔۔۔ زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو ۔۔۔ ہم سب جانتے ہیں۔" فاروق نے برا سا منہ بنایا۔

فرزانہ ہنستی ہوئی چلی گئی۔

"اب اسے نکال کر دیکھنا چاہیے۔" فاروق نے اس کے کمرے سے نکلتے ہی کہا۔

"پہلے میں باہر جا کر دیکھ لوں، کہیں فرزانہ دروازے کے باہر موجود نہ ہو ۔۔۔ وہ بہت چالاک ہے۔ اس کے کان میں بھنک پڑ چکی ہے۔" محمود نے آہستہ آواز میں کہا اور اٹھ کر دبے پاؤں دروازے کی طرف بڑھا ۔۔۔ اس نے ایک دم دروازہ کھول دیا۔ باہر جھانکا، مگر فرزانہ وہاں موجود نہیں تھی ۔۔۔ اس نے مطمئن ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

دروازہ بند ہوتے ہی فرزانہ نے آہستہ سے اپنا دروازہ کھولا اور باہر نکل آئی ۔۔۔ اب وہ محمود اور فاروق کے کمرے کے دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے کھڑی تھی۔ اس مرتبہ بھی وہ ان سے چالاک ثابت ہوئی تھی۔

محمود نے بستے میں سے شیشے کا ٹکڑا نکالا ۔۔۔ دونوں اسے الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ یہ مستطیل شکل کا اور ہلکے نیلے رنگ کا تھا۔ انہیں اس میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔

"حیرت ہے۔" محمود نے کہا۔

"میں خود حیران ہوں۔" فاروق بولا۔

"اور میں تم سے زیادہ حیران ہوں۔" باہر سے فرزانہ کی شریر آواز آئی۔ دونوں چونک اٹھے۔

"دھت تیرے کی — یہ شیطان کی خالہ تو دروازے پر موجود ہے۔" فاروق جھنجلا اٹھا۔

"دروازہ کھولو — نہیں تو میں ابھی جا کر ابّا جان سے بتاتی ہوں، اس شیشے کے ٹکڑے کے بارے میں۔"

"اب تو دروازہ کھولنا ہی پڑے گا۔" فاروق نے بے چارگی سے کہا اور اٹھ کر چٹخنی گرا دی۔

"ہوں — ذرا دیکھوں تو کیا چیز ہے یہ۔" وہ اندر آتے ہی تڑ سے بولی۔

محمود نے شیشے کا ٹکڑا اسے تھما دیا — چند لمحے تک وہ اسے الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی، آخر بولی:

"یہ کوئی عجیب چیز تو ہے نہیں۔"

"ہاں، ہمارا بھی یہی خیال ہے — لیکن ......" محمود کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"لیکن کیا؟" فرزانہ نے پوچھا۔

"جن حالات میں یہ ہم تک پہنچا ہے، وہ عجیب ضرور ہیں۔"

"وہ کیا ہیں، جلدی سے بتاؤ۔"

محمود نے فاروق کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا، جیسے اس سے پوچھ رہا ہو کہ فرزانہ کو بتاؤں یا نہ بتاؤں۔

"اب تو بتانا ہی پڑے گا — یہ پیچھا چھوڑنے والی کہاں ہے۔"

محمود نے شام کا واقعہ تفصیل سے سنا دیا۔

"حیرت ہے، اس معمولی سے ٹکڑے کی خاطر وہ اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔"

"ہو سکتا ہے، یہ کوئی اہم چیز ہو۔" فاروق نے خیال ظاہر کیا۔

"ظاہر میں تو ایسا نہیں ہے۔" فرزانہ بولی۔

"خیر، دیکھا جائے گا — اسے سنبھال کر رکھو — ہو سکتا ہے، یہ کوئی اہم چیز ہی ہو۔"

"ہاں، یہ ٹھیک ہے، بلکہ مجھے تو نہ جانے کیوں یقین ہوتا جا رہا ہے کہ یہ بہت قیمتی چیز ہے۔ میں اسے اپنی الماری میں رکھ دیتا ہوں۔" محمود نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے الماری کا دروازہ کھولا اور الماری کے دروازوں کی اوٹ میں جانے کیا کرنے لگا — کافی دیر ہو گئی، مگر وہ نہ پلٹا تو فرزانہ سے نہ رہا گیا۔

"کیا کرنے لگے، اتنی دیر لگا دی۔"

"اسے حفاظت سے رکھ رہا ہوں۔" محمود نے کہا: "دیکھو، اس کا ذکر ابا جان سے نہ کرنا، ورنہ وہ ناراض ہوں گے۔"

"میں جانتی ہوں، تم بے فکر رہو۔"

تفتیش

دوسرے دن انسپکٹر جمشید نے دفتر جاتے ہی رحیم اور شیشے کے ٹکڑے کی گم شدگی کی باقاعدہ رپورٹ کر دی۔۔۔ دوسرے ہی لمحے ڈی آئی جی کے چپراسی نے انہیں حاضر ہونے کا حکم سنایا۔۔ وہ پہلے ہی تیار تھے، فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹھو۔" ڈی آئی جی صاحب نے انہیں دیکھ کر کہا۔۔۔ وہ کافی فکرمند نظر آ رہے تھے۔ انسپکٹر جمشید ایک کرسی پر بیٹھ گئے۔

"یہ سب کیا ہے؟" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد انہوں نے رپورٹ کی طرف اشارا کر کے کہا۔

"یہ کام رحیم کے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔"

"کچھ بھی ہو، کیا میں نے شیشے کا وہ ٹکڑا دیتے وقت تمہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔"

"جی ہاں، آپ نے فرمایا تھا۔"

"تب پھر، تم نے اسے بحفاظت کیوں نہ رکھا؟"

"میں نے اسے میز کی دراز میں رکھا تھا اور دراز کی چابی ہر وقت میرے پاس رہی ہے۔"

"اگر تم نے شیشے کا وہ ٹکڑا فوراً ہی تلاش نہ کر لیا تو مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اپنی ملازمت پر بحال نہیں رہ سکو گے۔" انہوں نے سرد لہجے میں کہا۔

"جی۔" انسپکٹر جمشید دھک سے رہ گئے۔

"صرف یہی نہیں، میں بھی تمہارے ساتھ مصیبت میں پھنس گیا ہوں — وہ مجھے آئی جی صاحب نے دیا تھا۔"

"اوہ، مجھے بے حد افسوس ہے — آپ مجھے کچھ وقت دیں، میں اسے حاصل کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھوں گا۔"

"اسے حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ میں آج شام سات آٹھ بجے تک دفتر میں ہی موجود رہ کر تمہاری کامیابی کا انتظار کروں گا۔ جوں ہی وہ ملے، فوراً میرے پاس چلے آنا، ورنہ ناکامی کی صورت میں مجھے فون کر دینا۔"

"جی بہت بہتر، میں اسی وقت سے کوشش شروع کرتا ہوں۔ کیا آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ یہ ٹکڑا ہے کیا چیز؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"یہ تو خود مجھے بھی نہیں معلوم — خدا ہی بہتر جانتا ہے، یا پھر آئی جی صاحب کو معلوم ہوگا۔"

"ہوں۔"

"رحیم کی تلاش کے سلسلے میں کیا رہا؟"

"سب انسپکٹر اکرام اور اس کے تمام ماتحت شہر کا کونا کونا چھانتے پھر رہے ہیں۔ باقی تمام تھانوں کو اطلاع دی جا چکی ہے۔"

"اچھا، خدا تمہیں کامیابی عطا کرے۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔"

انسپکٹر جمشید ان کے کمرے سے نکل کر سیدھے ریکارڈ روم میں آئے۔ انہوں نے متعلقہ کلرک سے رحیم کی ذاتی فائل نکلوائی — فائل پڑھ کر انہیں معلوم ہوا کہ رحیم چھ سال پرانا ملازم ہے اور اس دوران پوری ایمانداری سے اپنا فرض انجام دیتا رہا ہے۔ رہائش کا پتا وہی درج تھا، جس پر وہ کل جا چکے تھے۔

وہ سوچ میں ڈوب گئے — اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ رحیم کو کوئی بڑا لالچ دیا گیا ہے — اس نے کسی طرح میز کی دراز کھولی، ٹکڑا نکالا اور غائب ہو گیا — یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ٹکڑا کسی اور نے چرایا ہو اور رحیم کو شک کی زد میں لانے کے لیے اسے غائب کر دیا ہو، تاکہ ہم یہی سمجھتے رہیں کہ ٹکڑا رحیم نے ہی چرایا ہے۔

یہ سب ٹھیک تھا — اب تو سوال اس ٹکڑے کو دوبارہ حاصل کرنے کا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے حاصل کریں گے — انہوں نے یہ سب کچھ سوچنے کے بعد سب سے پہلے انگلیوں کے نشانات کے ماہر کو بلا کر میز کی دراز سے انگلیوں کے نشانات

اٹھوائے۔ ایک گھنٹے بعد نشانات کی تصویر ان کے سامنے تھی۔ ان نشانات کو جب رحیم کی ذاتی فائل کے نشانات سے ملایا گیا تو وہ آپس میں مل گئے۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ ٹکڑا میز کی دراز سے رحیم نے ہی چرایا تھا۔ اب چرانے کے بعد اس نے کیا کیا اور وہ خود کہاں گیا۔ یہ دو باتیں انہیں معلوم کرنا تھیں۔ اس سلسلے میں انہوں نے رحیم کے ساتھی چپراسیوں سے بھی سوال کیے، لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہو سکی۔ شام کے ساڑھے تین بجے کے قریب سب انسپکٹر اکرام کی واپسی ہوئی۔ ناکامی اس کے چہرے سے صاف ظاہر تھی۔

"تو رحیم نہیں ملا۔" انسپکٹر جمشید نے خود ہی کہا۔

دفعتاً انہیں ایک خیال آیا۔ وہ چونک اٹھے۔ ابھی تک ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ انہوں نے فوراً اپنے اسسٹنٹ سے دفتر کے چوکیدار کو بلانے کے لیے کہا۔

"تم رحیم کے متعلق کیا جانتے ہو؟" انہوں نے چوکیدار کو تیز نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔

"جی، جی۔ کیا مطلب؟" چوکیدار اس اچانک سوال سے گھبرا گیا۔

"تم یہاں کب سے ملازم ہو۔" انہوں نے دوسرا سوال کر ڈالا۔

"جی۔ جی، تقریباً چھ سال سے۔"

"اور رحیم کتنے عرصے سے ملازم تھا؟"

"جی۔ جی، وہ بھی تقریباً چھ سال سے ملازم تھا۔"

"تقریباً نہیں، بلکہ تم دونوں ایک ہی دن ملازم ہوئے تھے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکرا کر کہا۔

"جی، مجھے یاد نہیں۔"

"لیکن مجھے اچھی طرح یاد ہے اور اب میں جو کچھ پوچھوں، اس کا ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ کیا پرسوں رات کو رحیم دفتر آیا تھا؟"

"جی نہیں۔"

"تم رات کو یہیں سوتے ہو نا؟"

"جی ہاں۔"

"تو سنو، پرسوں رات کو رحیم آیا تھا۔ تم نے اس کے لیے میرے کمرے کا دروازہ کھولا تھا اور پھر میز کی دراز کھولنے میں بھی اس کی مدد کی تھی۔ کیوں، کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"میں نہیں سمجھا، آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"بہت جلد سمجھ جاؤ گے۔ تم خود کو حراست میں سمجھو۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

دفعتاً چوکیدار کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف بڑھا۔

"خبردار، اگر تم نے حرکت کرنے کی کوشش کی۔" فوراً ہی انسپکٹر

جمشید کے ہاتھ میں پستول نظر آیا۔

"اس کی تلاشی لو۔" انہوں نے سب انسپکٹر اکرام سے کہا۔

سب انسپکٹر اکرام آگے بڑھا اور چوکیدار کی جیب میں سے پستول نکال لیا۔

○

تنویر اور شوکت تین بجے کے قریب پارک میں داخل ہوئے۔ انہوں نے دروازے کے دائیں طرف درخت کے نیچے دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔

"وہ دونوں ابھی تک نہیں آئے۔" شوکت بولا۔

"ضروری نہیں کہ وہ ہر روز یہاں آتے ہوں۔" تنویر نے کہا۔

"ہاں، ضروری تو نہیں، لیکن دیکھ لینے میں کیا حرج ہے۔ ہم چار بجے تک ان کا انتظار کریں گے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔"

"آخر یہ شیشے کا ٹکڑا ہے کیا بلا؟" شوکت بولا۔

"خدا جانے، ہمیں اس سے کیا غرض کہ وہ کیا چیز ہے۔ ہمیں تو اسے ہر حال میں انسپکٹر جمشید کے چپراسی سے حاصل کرنے کا حکم ملا تھا۔ کمال ہے، یہ رحیم بھی اپنے سردار کا آدمی نکلا۔ اب یہ

اور بات ہے کہ عین وقت پر اس کی نیت بدل گئی اور وہ اسے ہمارے حوالے کرنے کی بجائے بھاگ کھڑا ہوا۔ آخر اس نے ایسا کیوں کیا۔"

"اس نے سوچا ہوگا کہ یہ ضرور کوئی اہم چیز ہے۔ کیوں نہ اسے لے کر غائب ہو جائے اور پھر اس کی بڑی قیمت وصول کرے۔"

"سردار سے؟" شوکت نے حیرت سے کہا۔

"اور کس سے، ظاہر ہے کہ سردار اسے حاصل کرنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔" تنویر ہنسا۔

"کل اس نے ہماری بھی خوب خبر لی۔ لعنت ملامت کی اور آخری موقع دیا ہے۔ اب دیکھو، ہم وہ ٹکڑا حاصل بھی کر سکتے ہیں یا نہیں۔" شوکت نے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ بچوں نے اسے کھلونا سمجھ کر رکھ لیا ہوگا۔"

"شاید تمہارا خیال ٹھیک نکلے۔ خدا جانے وہ دونوں کب آتے ہیں۔"

"مجھے ایک اور خیال آ رہا ہے۔" تنویر نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

"اور وہ کیا؟" شوکت نے پوچھا۔

"کیوں نہ ہم بھی رحیم کے نقش قدم پر چلیں۔"

"کیا مطلب ؟" شوکت چونکا۔

"ٹکڑا ان بچوں سے حاصل کر کے غائب ہو جائیں۔"

"اور پھر......"

"اور پھر سردار سے ایک موٹی رقم کا مطالبہ کریں۔"

"وہ ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"ہم اس کے ہاتھ ہی نہیں آئیں گے۔"

"ایسا نہ کہو، وہ بہت باخبر ہے۔ کسی وقت بھی ہم تک پہنچ سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت بھی کہیں پاس ہی موجود ہو۔"

"چھوڑو یار۔" تنویر بولا۔

"نہ بھئی، میں تمہاری یہ تجویز ماننے پر تیار نہیں۔"

"اچھا خیر — ارے، کہیں وہ، یہی دونوں تو نہیں ہیں۔" تنویر نے چونکتے ہوئے کہا۔ اس کی نظریں پارک میں داخل ہونے والے لڑکوں پر تھیں۔ شوکت نے بھی انہیں دیکھا اور بولا:

"معلوم تو یہی ہوتے ہیں۔ پہلے انہیں آرام سے بیٹھ لینے دو، پھر ہم ان سے بات کریں گے۔"

○

محمود اور فاروق پارک میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں بستے

تھے۔ وہ سیدھے اس درخت کی طرف آئے جس کے نیچے بیٹھ کر پڑھا کرتے تھے۔

"کہیں فرزانہ اباجان سے اس ٹکڑے کا ذکر نہ کر دے۔" محمود بولا۔

"نہیں، وہ ایسا نہیں کرے گی، اگر اس نے ایسا کیا تو ہم آئندہ اسے کسی معاملے میں شریک نہیں کریں گے۔"

"مجھ سے ایک غلطی اور ہو گئی ہے۔" محمود بولا۔

"اور وہ کیا ؟" فاروق نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے شیشے کا ٹکڑا اس کے سامنے الماری میں رکھا تھا۔"

"تو پھر کیا ہوا ؟"

"ہوا یہ کہ میں نے الماری کو تالا بھی نہیں لگایا۔"

"کیا ؟" فاروق کے منہ سے نکلا۔

"ہاں، میں تالا لگانا بھول گیا۔"

"اوہ، تب تو وہ شاید اسے نکال لے۔"

"فاروق، ہوشیار۔" محمود چونک کر بولا۔

"کیا بات ہے ؟"

"دو لمبے تڑنگے آدمی ہماری طرف آ رہے ہیں اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ کل یہی دونوں اس شخص کا پیچھا کر رہے تھے۔"

"اوہ۔"

اسی وقت شوکت اور تنویر ان کے پاس پہنچ چکے تھے۔

"پیارے بچو، کیا پڑھ رہے ہو تم؟" شوکت نے پوچھا۔

"جی، اپنے کورس کی کتابیں پڑھ رہے ہیں" محمود نے جواب دیا۔

وہ دونوں ان کے پاس ہی گھاس پر بیٹھ گئے، پھر شوکت نے پیار بھرے لہجے میں کہا:

"کیا تم ہماری تھوڑی سی مدد کرو گے؟"

"جی فرمایئے۔"

"کل ایک شخص نے ہماری ایک چیز چرالی تھی۔ ہم ان کے پیچھے بھاگے تو وہ پارک میں گھس گیا۔ آگے جاکر ہم نے اسے پکڑ لیا اور جب اپنی چیز کا مطالبہ کیا تو اس نے بتایا کہ وہ چیز اس نے تم دونوں کے پاس گرادی تھی۔ کیا اس نے تمہارے پاس کوئی چیز گرائی تھی؟"

"کیا چیز تھی وہ؟" فاروق نے بے تابی سے پوچھا۔

"شیشے کا ایک ٹکڑا، مستطیل ٹکڑا، ہلکے نیلے رنگ کا۔"

"جی — جی نہیں تو — ہمیں تو ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔"

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"بالکل۔"

"دیکھو، ہم تمہیں اس ٹکڑے کے پانچ روپے دے سکتے ہیں۔"

"پانچ روپے۔" فاروق خوش ہو کر بولا: "کاش وہ ٹکڑا ہمیں ملا ہوتا تو ہم پانچ روپے حاصل کر لیتے۔"

"تو وہ تمہیں نہیں ملا۔"

"جی نہیں۔" فاروق نے کہا — اس کے لہجے میں افسوس تھا۔

"ہم تمہیں اس سے بھی زیادہ پیسے دے سکتے ہیں — کیا تم بیس روپے کے بدلے وہ ٹکڑا ہمیں دے سکتے ہو؟"

"بھئی وہ ہمیں ملا ہو تو تمہیں دے بھی دیں۔" فاروق نے اکتا کر کہا۔

"ہوں، تم یوں نہیں مانو گے — اس شخص نے قسم کھا کر کہا تھا کہ اس نے ٹکڑا تم دونوں کے پاس گرایا تھا۔ کیا تم دونوں کل اسی جگہ نہیں بیٹھے تھے؟"

"یہ ٹھیک ہے، ہم یہیں بیٹھے تھے۔"

"تب ہم تمہارے بستوں کی تلاشی لیں گے۔"

"ضرور، بڑے شوق سے۔" دونوں نے ان کے آگے اپنے بستے الٹ دیے۔

شوکت اور تنویر مایوس ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اچھا بھئی، ہمیں افسوس ہے، تمہیں یونہی پریشان کیا۔"

"کوئی بات نہیں۔"

"اگر وہ ٹکڑا تمہیں کہیں گرا پڑا مل جائے تو اسے سنبھال کر رکھنا

اور بیس روپے کے بدلے ہمیں دے دینا۔"

"ہاں ہاں، ضرور — بھلا ہم بیس روپے کیوں ہاتھ سے جانے دیں گے۔"

"شاباش۔"

وہ دونوں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پارک سے باہر نکل گئے۔ ان کے نکلتے ہی دونوں نے ایک دوسرے سے زوردار انداز میں ہاتھ ملائے اور ہنس پڑے، پھر محمود نے کہا:

"بھئی یہ ٹکڑا تو اہمیت اختیار کرتا جا رہا ہے۔"

"ہاں، واقعی — پتا نہیں یہ کیا بلا ہے۔"

○

شوکت اور تنویر پارک سے نکل کر ایک ٹی سٹال میں آکر بیٹھ گئے۔

"کیا خیال ہے۔ کیا یہ دونوں جھوٹ بول رہے ہیں یا رحیم ہی ہمیں چکر دے رہا ہے۔" شوکت بولا۔

"لڑکے بہت چالاک ہیں — مجھے یقین ہے، شیشے کا ٹکڑا انہی کے پاس ہے۔" تنویر نے خیال ظاہر کیا۔

"تو پھر کیا کیا جائے؟"

"اگر ٹکڑا ان کے پاس ہے، تو ہم آسانی سے حاصل کر لیں گے۔"

"وہ کیسے؟" شوکت نے پوچھا۔

"ان کا تعاقب کرتے ہوئے، ان کے گھر تک پہنچنے کی کوشش کریں گے اور یہ وہاں پہنچ کر دیکھیں گے کہ ٹکڑا حاصل کرنے کی کیا صورت ہے۔" تنویر نے ترکیب بتائی۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

"میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، وہ ٹکڑا انہی کے پاس ہے۔" کچھ دیر خاموش رہ کر تنویر نے کہا۔

"آخر وہ اسے اپنے پاس رکھ کر کیا کریں گے — ہو سکتا ہے، وہ انہیں ملا ہی نہ ہو۔" شوکت نے خیال ظاہر کیا۔

"خیر پتا چل جائے گا۔"

چائے آگئی تھی — دونوں چائے کی چسکیاں لینے لگے:

"آخر یہ ٹکڑا ہے کیا بلا — اور ہمارے سردار کو اس کی کیا ضرورت پیش آگئی۔" شوکت سوچتے ہوئے بولا۔

"اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ کوئی بہت اہم چیز ہے، کیا ہے، یہ میں نہیں جانتا۔"

"مجھے الجھن سی ہوتی ہے۔" شوکت نے کہا۔

"کیوں؟"

"بھئی یہ الجھن کی بات ہی تو ہے — شیشے کا ایک معمولی سا

ٹکڑا — اور اس کی خاطر اتنی بڑی بھاگ دوڑ"

"بھئی سردار کے بھید سردار ہی جانے — اسے ضرور معلوم ہے کہ یہ ٹکڑا کیا چیز ہے، تبھی تو اس کی راتوں کی نیند اڑی ہوئی ہے:"

"اس کی نہیں، ہماری اڑی ہوئی ہے — وہ خود تو آرام سے بیٹھا ہوگا:"

"میں تو اس زندگی سے تنگ آ گیا ہوں" شوکت نے اچانک موضوع بدل دیا۔

"کیا مطلب؟"

"ہاں، اب میں چاہتا ہوں، اس مجرمانہ زندگی کو چھوڑ کر شریفانہ زندگی بسر کروں:"

"کیا کرنا چاہتے ہو:"

"کوئی کاروبار"

"لیکن کاروبار کے لیے پیسہ کہاں سے لاؤ گے؟"

"اسی انتظار میں ہوں کہ کوئی بڑا ہاتھ ماروں اور پھر الگ ہو جاؤں:"

"سردار تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا" تنویر نے کہا۔

"کیوں، اس کے لیے ہم یا تم کسی خطرے کا سبب تھوڑا ہی بن سکتے۔ ظاہر ہے کہ ہم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتے، وہ کون ہے، کیا کرتا ہے، کہاں رہتا ہے۔ اس کا حکم ہمیں اچانک ملتا ہے، چاہے ہم گھر میں ہوں یا گھر سے باہر — ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے

وہ ہماری نگرانی ہر وقت کرتا رہتا ہے:"

"نہیں خیر، ہر وقت تو کیا ساتھ رہتا ہوگا۔ اتنا ضرور ہے کہ ہمیں اچانک حکم ملتا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ کس وقت اس کا کیا حکم مل جائے گا:" تنویر نے کہا۔

"تو پھر، کیا خیال ہے — تم میرا ساتھ دو گے یا اسی زندگی میں خوش ہو:"

"دیکھا جائے گا، ابھی کیا کہہ سکتا ہوں — پہلے دولت تو ہاتھ لگنے دو کہیں سے — ارے، ہم باتوں میں لگے ہوئے ہیں۔ پارک کے دروازے کی طرف بھی دھیان رکھو"

"میں برابر دروازے کی طرف دیکھ رہا ہوں — وہ دونوں ابھی تک ..... لو، وہ نکل رہے ہیں:"

"چلو اٹھو — دھیان رہے، انہیں ذرا بھی شک نہ ہونے پائے:"

دونوں ٹی سٹال سے باہر نکل آئے۔

○

چوکیدار کی جیب سے پستول کا برآمد ہونا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ انسپکٹر جمشید، ان کا اسسٹنٹ اکرام اور دوسرے دو تین آدمی حیرت کا بت بنے اسے دیکھ رہے تھے۔ آخر انسپکٹر جمشید چونکے:

"ہتھکڑی لگا دو اسے۔"

اکرام نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔

"ہاں، اب بتاؤ، رحیم کہاں گیا؟"

"مجھے معلوم نہیں۔" چوکیدار نے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

"یہ یوں نہیں بتائے گا — اسے امتحان گاہ میں لے چلو۔" انہوں نے حکم دیا۔

امتحان گاہ ایک خاص کمرے کا نام تھا — یہاں سخت سے سخت مجرموں کی زبان کھلوانے کے مختلف قسم کے عجیب وغریب آلات لگے ہوئے تھے۔ چوکیدار کو اس کمرے میں ایک کرسی پر بٹھا کر تسموں سے کس دیا گیا۔

"اب اسے بجلی کا ہلکا سا جھٹکا دو، تاکہ یہ اندازہ ہو سکے کہ اس کی زبان کھلوانے کے لیے ہمیں کن کن مشکلات سے گزرنا پڑے گا۔"

"نہیں نہیں۔" چوکیدار کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں۔

"تو پھر بتاؤ، وہ سب کچھ بتاؤ، جو تم جانتے ہو، ورنہ۔" انسپکٹر جمشید رک گئے۔

"میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں — رحیم اور میں گہرے دوست ہیں۔ آج سے چھ سال پہلے ہم بالکل بے کار تھے — روزی کی تلاش میں سارا سارا دن مارے مارے پھرتے تھے کہ ایک دن ہمیں ایک پرچہ ملا — اس میں لکھا تھا، تم دونوں کو ملازم رکھا جاتا ہے۔

ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو تمہیں دو دو سو روپے تنخواہ مل جایا کرے گی۔ تمہیں صرف اتنا ہی کرنا ہوگا کہ جو حکم ملے، اس پر عمل کرو۔ اس طرح ہمیں اس کی ہدایات پرچوں پر ملنے لگیں، پھر ایک دن حکم ملا کہ محکمہ سراغرسانی میں چپراسی اور چوکیدار کی جگہوں کے لیے درخواستیں دے دیں اور ہم بغیر کسی پوچھ گچھ کے ملازم رکھ لیے گئے۔ پرسوں رحیم کو حکم ملا کہ آپ کی میز کی دراز میں سے شیشے کا ٹکڑا نکال لائے — اس نے یہ بات مجھے بھی بتا دی تھی۔" چوکیدار اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"ہوں، تم ایک ساتھ رہتے ہو؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

"شیشے کا ٹکڑا رحیم کو کہاں پہنچانا تھا؟"

"اس نے مجھے یہ نہیں بتایا۔"

"ٹکڑا اس نے میز کی دراز سے کب چرایا؟"

"کل صبح سویرے، آپ کے آنے سے چند منٹ پہلے۔ ابھی وہ نکال ہی پایا تھا کہ آپ آ گئے۔"

"ہوں، اس کے متعلق تمہیں بھی کوئی ہدایت ملی تھی؟"

"جی نہیں۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم بدستور چوکیداری کرتے رہتے۔ کیا اس سے پہلے بھی کچھ چیزیں چرا کر اپنے سردار کو دے چکے ہو؟"

"جی ہاں۔"

"بہت خوب — اب ذرا مہمان خانے میں آرام کرو — تمہارے متعلق فیصلہ اس کیس کے بعد کیا جائے گا — لے جاؤ اسے اور بند کردو، کڑی نگرانی میں رکھو — اگر کوئی اس سے ملنے آئے تو اسے بھی گرفتار کرلو۔" انسپکٹر جمشید نے اپنے دو ماتحتوں کو حکم دیا — پھر اکرام سے کہا۔

"اکرام، چھ سال پہلے کا ریکارڈ نکال کر معلوم کرو کہ رحیم اور چوکیدار کو کس نے ملازم رکھا تھا — جہاں تک مجھے یاد ہے، اس وقت ڈی آئی جی سردار خان تھے اور انہوں نے ہی ان دونوں کو ملازم رکھا تھا، پھر بھی تم تصدیق کرلو۔"

"جی بہتر۔" اکرام نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔ تقریباً آدھ گھنٹے بعد اس کی واپسی ہوئی۔

"آپ کا خیال ٹھیک ہے سر، انہیں ڈی آئی جی سردار خان نے تعینات کیا تھا۔"

"سردار خان کو ریٹائر ہوئے تو کافی عرصہ ہوگیا ہے۔"

"جی ہاں — تقریباً ساڑھے پانچ سال۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے، وہ کہاں رہتے ہیں؟"

"جن دنوں وہ ملازم تھے، گلستان روڈ پر رہتے تھے۔"

"اور اب؟"

"اب شاداب گڑھ میں رہتے ہیں۔"

"کوٹھی کا نمبر معلوم ہے؟"

"جی نہیں، لیکن میں نے کوٹھی دیکھی ہوئی ہے۔"

"تو پھر آؤ میرے ساتھ۔"

انہوں نے اکرام کو اپنے پیچھے بٹھا لیا اور شاداب گڑھ کی طرف روانہ ہوگئے۔ انہیں وہاں پہنچنے میں صرف چند منٹ لگے۔ گھنٹی بجانے پر ایک ملازم نے دروازہ کھولا۔

"سردار صاحب ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"ان سے کہو، انسپکٹر جمشید آیا ہے۔"

"جی بہتر — آپ اندر تشریف رکھیے۔"

ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور سردار صاحب کو اطلاع دینے چلا گیا۔

"ہیلو انسپکٹر جمشید، میں تمہیں تقریباً چھ سال بعد دیکھ رہا ہوں۔" وہ سردار صاحب کی آواز سن کر چونک اٹھے۔

چھ سال پہلے کے سردار خان کی شکل و صورت میں کوئی خاص فرق واقع نہیں ہوا تھا۔

"اسلام علیکم سر۔" انسپکٹر جمشید نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کہو بھئی، کیسے آنا ہوا؟"

"جی ایک معمولی سا کام تھا۔"

"ہاں ہاں، کہو۔"

"چپراسی رحیم اور چوکیدار غفور آج سے چھ سال پہلے ملازم ہوئے تھے اور انہیں آپ کے حکم پر ملازم رکھا گیا تھا۔"

"اچھا تو پھر۔"

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ انہیں کس کی سفارش پر ملازم رکھا گیا تھا؟"

"کس کی سفارش پر ملازم رکھا گیا تھا۔" سردار صاحب نے سوچتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔"

"بھئی کچھ یاد نہیں آ رہا۔"

"ذرا ذہن پر زور دیجیے۔"

"میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، لیکن یاد نہیں آ رہا ہے۔"

"ہو سکتا ہے، آپ کو یاد آ جائے۔ یہ بہت ضروری ہے۔ جس وقت بھی یاد آ جائے، مجھے فون کر دیں۔"

"اچھا۔"

"بیٹھو بھئی، چائے پی کر جانا۔"

"نہیں سر۔ ابھی بہت کام ہے، شکریہ۔" انسپکٹر جمشید اور

اکرام اٹھ کھڑے ہوئے۔

"اوہو، بھئی مجھے یاد آ گیا۔" سردار صاحب دروازے کی طرف چلتے ہوئے اچانک بولے:

"جی، یاد آ گیا ہے، تو پھر بتائیے، کس نے ان کی سفارش کی تھی۔"

"خان جبار نے۔" سردار خان نے کہا۔

"یہ کون ذاتِ شریف ہیں؟"

"ایک بہت بڑا کاروباری آدمی ہے۔ ایک بار میں نے اس کے ساتھ مل کر کچھ کاروبار کیا تھا، ان ہی دنوں اس نے ان دونوں کی سفارش کی تھی۔"

"بہت خوب، یہ کہاں رہتا ہے؟"

"مسلم آباد، کوٹھی نمبر شاید ۹ ہے۔"

"بہت بہت شکریہ۔"

"تم نے بتایا نہیں معاملہ کیا ہے؟" سردار خان نے پوچھا۔

"میں آپ کو ضرور بتاؤں گا۔ لیکن اس وقت بہت جلدی میں ہوں۔"

"اچھا۔"

اب ان کا رخ مسلم آباد کی طرف تھا۔ نو نمبر کوٹھی تلاش کرنے میں انہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

"فرمائیے" — ایک ملازم نے دروازے پر نمودار ہو کر پوچھا۔

"خان جبار یہیں رہتے ہیں؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی ہاں"

"ہمیں ان سے ملنا ہے"

"لیکن وہ تو ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں"

"کیا؟"

"جی ہاں، وہ تو اکثر کاروبار کے سلسلے میں ملک سے باہر ہی رہتے ہیں"

"ہوں، گھر میں کون رہتا ہے؟"

"بیگم صاحبہ، خان صاحب کے بیٹے، بیٹیاں"

"ہوں، تو پھر ہمیں بیگم صاحبہ سے ملا دو — میرا نام انسپکٹر جمشید ہے"

"جی بہتر، آپ اندر تشریف لے آئیں"

ملازم نے انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور بیگم صاحبہ کو اطلاع دینے چلا گیا — تھوڑی دیر بعد ہی ایک درمیانی عمر کی عورت اندر داخل ہوئی —

"فرمائیے" اس نے خوش اخلاق مسکراہٹ سے کہا۔

"خان جبار کب تک لوٹیں گے؟" انسپکٹر جمشید نے ڈرائنگ روم کا بغور جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتی — شاید ایک ماہ لگ جائے"

"یہ تصویر انہی کی ہے؟" انسپکٹر جمشید نے کمرے میں لگی ہوئی ایک تصویر کی طرف اشارا کر کے پوچھا۔

"جی ہاں"

تصویر ایک معمر آدمی کی تھی — جس کے چہرے پر بڑی بڑی خوف ناک مونچھیں تھیں —

"شکریہ، آپ کو یوں ہی تکلیف دی"

"کوئی بات نہیں — کیا ان سے کوئی خاص کام تھا؟" بیگم جبار نے پوچھا۔

"جی ہاں، ایک ضروری کام تھا — کیا آپ کو بیرون ملک ان کا پتا معلوم ہے؟"

"جی نہیں، وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتے"

"اچھا شکریہ"

دونوں باہر نکل آئے تو اکرام نے پوچھا:

"میں حیران ہوں، بیگم جبار سے آپ نے پوچھا تو کچھ بھی نہیں"

"مقصد حاصل ہو گیا ہے — میں خان جبار کی تصویر دیکھنا چاہتا تھا۔ اب تم اپنے دو آدمی خان جبار کی کوٹھی پر لگا دو — انہیں خان جبار کا حلیہ بتا دینا — جونہی وہ نظر آئے فوراً رپورٹ کریں"

"جی بہتر" اکرام نے کہا۔

گھر واپس لوٹنے سے پہلے انہوں نے ڈی آئی جی کو فون کرنا ضروری سمجھا جو کہ دفتر میں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ ایک پبلک فون بوتھ میں گھس گئے اور نمبر ڈائل کرنے لگے۔

تعاقب

محمود اور فاروق پارک سے نکلے۔ ان کا رخ گھر کی طرف تھا۔ شام کے پونے پانچ بج رہے تھے۔ سورج مغرب کی طرف جھکتا جا رہا تھا۔

"شیشے کا ٹکڑا ضرور کوئی اہم چیز ہے۔" محمود نے کہا۔

"ہاں، ان حالات میں یہی کہا جا سکتا ہے۔" فاروق سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

"پھر اب کیا کرنا چاہیے؟"

"کیوں نہ ابا جان کو سب کچھ بتا دیں۔" فاروق نے کہا۔

"وہ ناراض ہوں گے۔" محمود نے انکار میں سر ہلایا۔

"تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ پہلے فرزانہ سے مشورہ کرتے ہیں۔ اس کا ذہن بہت تیزی سے کام کرتا ہے۔" فاروق نے تجویز پیش کی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ فاروق، تم نے کچھ محسوس کیا؟" محمود نے

سرگوشی کی۔

"کیا؟"

"کوئی مسلسل ہمارے پیچھے آ رہا ہے۔"

"تمہیں وہم ہوا ہے۔"

"پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا۔ ہو سکتا ہے، میرا وہم ہی ہو، پھر بھی میں ایسا خیال نہیں کرتا۔"

"اب کیا کریں؟"

"چلتے رہو اطمینان سے۔ میرا خیال ہے کہ ہم کسی بڑے چکر میں پھنسنے والے ہیں۔"

"تب تو آگئی شامت۔" فاروق بولا۔

"ہو سکتا ہے، اس بار کوئی بڑا کارنامہ ہمارے ہاتھوں انجام پا جائے۔"

"دیکھا جائے گا، اب بتاؤ، کیا ارادہ ہے؟"

"گھر چلیں گے بھئی، اور کیا کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ ظاہر کیے بغیر کہ ہمیں تعاقب کا پتا چل گیا ہے۔"

"اور گھر جا کر کیا کریں گے؟" فاروق نے پوچھا۔

"پائیں باغ والی کھڑکی میں سے دیکھیں گے کہ یہ کون ذات شریف ہے۔" محمود نے کہا۔

"ہو سکتا ہے، یہ وہی دونوں ہوں۔" فاروق نے خیال

ظاہر کیا۔

"ہاں، یہ بھی ممکن ہے۔"

وہ چلتے رہے، یہاں تک کہ گھر کے سامنے پہنچ گئے۔ اندر داخل ہو کر وہ سیدھے اپنے کمرے میں آئے اور پائیں باغ والی کھڑکی کھولی۔ دونوں کے کلیجے دھک سے رہ گئے۔

شیشے کا ٹکڑا حاصل کرنے والے دونوں بدمعاش گلی میں موجود تھے۔

○

انسپکٹر جمشید کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ کر شوکت اور تنویر نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

"تم دیکھ رہے ہو۔" شوکت بولا۔

"تو وہ دونوں لڑکے اس کے ہیں؟"

"اور کس کے ہو سکتے ہیں۔" تنویر کی آواز میں خوف تھا: "میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ بچے بہت چالاک ہیں۔"

"اب ہمارا یہاں ٹھہرنا خطرناک ہوگا۔ انسپکٹر جمشید کوئی معمولی آدمی نہیں ہے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس نے ہمیں گھر میں داخل ہونے سے پہلے ضرور دیکھا ہوگا۔" شوکت نے کہا۔

"ہاں، یہ تو ٹھیک ہے۔"

"تو پھر کھسک چلو یہاں سے۔"

"لیکن ہم سردار کو کیا جواب دیں گے۔"

"یہی کہ اب معاملہ ہمارے بس میں نہیں رہا۔"

"تم جانتے ہو — وہ ایسا جواب سننا پسند نہیں کرتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے، لیکن اب انسپکٹر جمشید سے کون ٹکر لے — اس سے ٹکر لینا تو موت کے منہ میں جانے کے برابر ہوگا۔" شوکت نے کہا۔

"کیوں نہ ہم ایک کوشش کر دیکھیں۔" تنویر نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" شوکت چونکا۔

"میرا مطلب ہے کہ اب یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ٹکڑا دونوں لڑکوں کے پاس ہے۔" تنویر بولا۔

"ہاں، یہ بات یقینی ہے۔"

"تو کیوں نہ اندر داخل ہو کر اسے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔"

"پاگل ہوئے ہو، انسپکٹر جمشید کے ہوتے ہوئے ہم کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"پاگل میں نہیں، تم ہو — ہم یہ کام آدھی رات کے وقت کریں

گے۔ اس وقت یہ سب گہری نیند سو رہے ہوں گے۔"

"میں پھر بھی اس پر تیار نہیں — میری رائے تو یہی ہے کہ جا کر سردار کو آگاہ کر دیں اور پھر وہ جیسا کہے گا، کریں گے۔ ہو سکتا ہے، وہ کچھ اور آدمی ہمارے ساتھ بھیج دے۔" شوکت نے تجویز پیش کی۔

"اس صورت میں ہمیں سردار کی ناراضی مول لینا پڑے گی — دوسری صورت میں ہو سکتا ہے، وہ ہمیں کوئی بھاری انعام دے دے۔" تنویر نے جواب دیا۔

"تم انعام کے لیے مرے جا رہے ہو اور میں سمجھتا ہوں، ہماری زندگیاں خطرے میں ہیں۔"

"ارے زندگیوں کا کیا ہے، یہ تو ہر وقت ہی خطرے میں رہتی ہیں۔"

"اچھا خیر — اس وقت تو یہاں سے چلو۔ آدھی رات کو ہم ایک کوشش کر دیکھیں گے۔" آخر شوکت نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے، چلو۔"

دونوں مڑے اور گلی سے نکل گئے۔

○

"شام کے سات بجے تھے۔ ڈی آئی جی صاحب ابھی تک اپنے دفتر
میں موجود تھے اور اب گھر جانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ابھی ابھی انہیں
انسپکٹر جمشید کا ٹیلی فون ملا تھا، جنہوں نے بتایا تھا کہ شیشے کا ٹکڑا ابھی
نہیں ملا، لیکن کوشش جاری ہے اور زبردست امید ہے کہ جلد ہی
مل جائے گا۔ ڈی آئی جی صاحب نے بات اپنے تک ہی رکھی تھی۔
ان کا خیال تھا کہ انسپکٹر جمشید شیشے کا ٹکڑا حاصل کرنے میں کامیاب ہو
جائیں گے۔

مایوس ہو کر وہ اُٹھے اور دروازے کی طرف بڑھے ہی تھے کہ
فون کی گھنٹی بجی — دوسری طرف آئی جی صاحب تھے۔

"شیشے کا وہ ٹکڑا لے کر میرے گھر آجایئے۔ خیال رہے کہ کسی
کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہو۔"

"جی، شیشے کا ٹکڑا لے کر آجاؤں؟"

"ہاں بھئی!" آئی جی صاحب نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

ڈی آئی جی صاحب نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ان
کے ہوش و حواس جواب دیتے جا رہے تھے۔

"جمشید، تم نے مجھے کہیں کا نہ چھوڑا۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے باہر
نکل آئے۔

جیپ میں بیٹھ کر وہ آئی جی صاحب کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔
جب وہ آئی جی صاحب کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ

کر سخت حیران ہوئے کہ وہاں محکمہ سراغرسانی کے سات بڑے بڑے افسر
موجود تھے اور آئی جی صاحب ان سے کہہ رہے تھے:

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ پروفیسر رشدی جیسے لوگ ہمارے
ملک میں پیدا ہوئے اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم ان کی
حفاظت نہ کر سکے۔ آج سے ایک ہفتہ پہلے وہ اپنی تجربہ گاہ میں
مردہ پائے گئے — آپ سب جانتے ہیں کہ انہیں قتل کیا گیا تھا،
لیکن کیا آپ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ ان دنوں کس تجربے
پر کام کر رہے تھے؟"

کسی نے ان کی بات کا جواب نہیں دیا — ڈی آئی جی صاحب
اس وقت تک ایک کرسی پر بیٹھ چکے تھے اور انہوں نے درمیان
میں دخل دینا مناسب نہ سمجھا تھا، نہ ہی آئی جی صاحب نے انہیں
دیکھ کر ان سے کچھ کہا۔ ایک بار پھر وہ کہنے لگے:

"چند دن پہلے پروفیسر صاحب کا فون مجھے ملا تھا — انہوں نے
بتایا کہ ان کی زندگی خطرے میں ہے، لہٰذا ان کی حفاظت کے لیے کچھ
کیا جائے۔ میں نے اسی وقت پانچ آدمیوں کی ایک پارٹی ان کی
کوٹھی پر تعینات کر دی — افسوس! یہ پارٹی ان کی جان نہ بچا سکی
اور وہ ہم سے جدا ہو گئے، لیکن مرنے سے کچھ دیر پہلے انہوں نے ایک
چھوٹا سا پارسل مجھے بھیجا۔ آپ جانتے ہیں، اس پارسل میں کیا تھا۔ شیشے کا
ایک مستطیل ٹکڑا۔"

"شیشے کا ٹکڑا" کسی کے منہ سے نکلا۔ چند ایک مذاق کے طور پر مسکرائے بھی۔

"ہاں شیشے کا ٹکڑا۔ انہوں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ میری زندگی کا کوئی بھروسا نہیں، اس لیے قوم کی امانت میں تمہیں بھیج رہا ہوں۔ شیشے کا یہ ٹکڑا دراصل ایک چھوٹا سا بکس ہے اور اس بکس میں ایک فارمولا ہے۔ یہ ایک حیرت انگیز بم کا فارمولا ہے، ہمارا ملک اس بم کو بنانے کے بعد دشمن ملک کی اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے۔ بم بہت آسانی سے بن سکتا ہے اور اس پر لاگت بھی بہت معمولی سی آئے گی۔ اب ہمارا ملک اسلحے کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہے گا۔ آخر میں اس خط میں بم کے متعلق اور بہت سی باتیں تھیں جو صرف سائنس دانوں کے پلے ہی پڑ سکتی ہیں۔ یہ بھی لکھا تھا کہ دشمن ملک کے جاسوسوں کو اس فارمولے کی خبر ہو چکی ہے اور وہ اسے حاصل کرنے کے چکر میں ہیں اور یہ کہ بکس کو پوری احتیاط سے رکھا جائے۔ اگر اسے ذرا بھی جھٹکا لگا تو بکس پھٹ جائے گا اور اس میں درج شدہ فارمولا ضائع ہو جائے گا۔" آئی جی صاحب نے اپنی بات ختم کر کے ان سب کو دیکھا۔ چند لمحے ٹھہر کر پھر کہنے لگے:

"میں نے بکس کو کھولنے کی پوری کوشش کی، لیکن پورے پانچ گھنٹے کی مسلسل کوشش کے بعد بھی کامیاب نہیں ہوا۔ تنگ آ کر چند دن پہلے میں نے یہ ڈی آئی جی صاحب کے حوالے کر دیا۔ اب میں نے آپ

سب کو اس لیے بلایا ہے کہ سب لوگ باری باری اسے کھولنے کی کوشش کریں۔ ہاں، تو لائیے وہ ٹکڑا۔" انہوں نے آخری جملہ ڈی آئی جی صاحب سے کہا۔

لیکن ڈی آئی جی صاحب تو ساکت و جامد پتھر کے بت کی مانند بیٹھے تھے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنی کرسی کی پشت پر ڈھلک گئے۔

"ارے، یہ تو بے ہوش ہو گئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیشے کا بکس ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔" کسی نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" آئی جی بولے۔ ان کے لہجے میں گھبراہٹ تھی۔

ڈی آئی جی صاحب کو ہوش میں لایا گیا تو وہ کمزور آواز میں بولے:

"میں نے حفاظت کے خیال سے وہ بکس انسپکٹر جمشید کے حوالے کر دیا تھا۔"

"تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ انسپکٹر جمشید بہت فرض شناس ہے اور چیز کی حفاظت کرنا خوب جانتا ہے۔ اسے یہیں بلا لیتے ہیں۔"

"وہ، وہ اب اس کے پاس نہیں ہے۔"

"کیا؟" سب کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

"ہاں، دشمن اسے اڑا چکے ہیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا۔ انسپکٹر جمشید کہاں ہے؟"

"وہ صبح سے اسی سلسلے میں بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔ ابھی گھر گیا ہے۔"

"تو اس وقت وہ اپنے گھر ہے؟"

"جی ہاں۔"

"تو ہم سب اسی وقت اس کے گھر چلیں گے۔ معلوم ہوتا ہے، انسپکٹر جمشید ملک سے غداری کر رہا ہے۔" آئی جی صاحب نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ کاروں اور جیپوں کا ایک چھوٹا سا قافلہ انسپکٹر جمشید کے گھر کا رخ کر رہا تھا۔

دروازہ بند کردو

انسپکٹر جمشید کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ شیشے کا ٹکڑا اتنی اہمیت اختیار کر جائے گا۔ وہ ابھی ابھی تفتیش کرکے اور ڈی آئی جی صاحب کو فون کرکے گھر لوٹے تھے اور کسی حد تک مطمئن تھے۔ اچانک کاروں اور جیپوں کے بہت سے ہارن ایک ساتھ بجے۔ اس وقت شام کے آٹھ بجے تھے۔

"یہ کیا مصیبت ہے، محمود ذرا جا کر دیکھنا۔" انہوں نے پریشان ہو کر کہا۔

محمود نے دروازہ کھولا ہی تھا کہ اسی وقت آٹھ نو آدمی دروازے پر پہنچ گئے۔

"بیٹا، تمہارے ابو گھر پر ہیں؟" آئی جی صاحب نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"تو انہیں فوراً بلاؤ۔"

"جی بہتر۔"

انسپکٹر جمشید دروازے پر آئے۔۔۔ دوسرا لمحہ ان کی زندگی کا سب سے حیران کن لمحہ تھا۔ ان کے ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ اور دوسرے بھی بڑے افسر ان کے دروازے پر موجود تھے۔

"یا الٰہی خیر" انہوں نے دل ہی دل میں کہا۔

"خیریت تو ہے۔ آپ لوگوں نے کیوں تکلیف کی۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔"

"پہلے اندر چل کر بیٹھو، ہم کچھ خاص بات کرنے آئے ہیں۔"

"آئیے"

وہ سب ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئے۔۔۔ محمود، فاروق، فرزانہ اور ان کی امی حیران و پریشان دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے۔ اچانک فرزانہ کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ اٹھ کر ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" ان کی امی نے پوچھا۔

"کہیں نہیں، ڈرائنگ روم کے دروازے تک جا رہی ہوں۔"

"کیا اندر ہونے والی گفت گو سنو گی؟" محمود نے پوچھا۔

"ارادہ تو یہی ہے۔"

"اگر ابا جان کو پتا چل گیا تو خوب مرمت ہو گی۔"

"لیکن اس وقت اندر کی گفت گو سننا بہت ضروری ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابا جان مصیبت میں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ان کے کسی کام آ سکیں۔" فرزانہ نے پختہ لہجے میں کہا۔

"خیال تو اچھا ہے۔" بیگم جمشید بول اٹھیں۔

"ٹھیک ہے، چلی جاؤ۔۔۔ مگر دبے پاؤں جانا۔ تمہارے کان بھی ہم سب سے تیز ہیں۔"

"خدا حافظ۔۔۔" فرزانہ نے کہا، پھر ڈرائنگ روم کے دروازے پر دبے پاؤں چلتی ہوئی آئی۔۔۔ دوسرے ہی لمحے اس نے دروازے سے کان لگا دیا۔ اس کے کانوں سے جو جملہ سب سے پہلے ٹکرایا، وہ تھا:

"وہ شیشے کا ٹکڑا کہاں ہے؟"

شوکت اور تنویر اکٹھے رہتے تھے۔۔۔ وہ گھر پہنچے تو انہوں نے سردار کا حکم ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا پایا۔ لکھا تھا:

"فوراً پہنچو۔"

"لو، اب وہاں حاضری دو۔۔۔ وہ ضرور اس شیشے کے ٹکڑے کے بارے میں پوچھے گا۔" شوکت نے برا سا منہ بنایا۔

"اب جانا تو پڑے گا ہی۔"

"چلو بھائی، اس زندگی میں چین کہاں۔" دونوں فوراً ہی گھر سے نکلے۔

"ہمارا سردار آج تک ہمارے سامنے نہیں آیا۔ عورتوں کی طرح ہر وقت نقاب پہنے رکھتا ہے۔" شوکت نے ایک ٹیکسی روکتے ہوئے کہا۔ ٹیکسی ان کے قریب آکر رک گئی۔

"عورتوں کی طرح کیوں، عورتیں تو اب پردے سے بے نیاز

ہوتی جا رہی ہیں۔" تنویر نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔

"چھوڑو بھائی، بور نہ کرو۔ کئی بار میرے جی میں آچکا ہے کہ سردار کے گھر میں کسی دن چھپ کر گھس جاؤں اور اسے دیکھ لوں۔"

ٹیکسی چل پڑی تھی۔

"ہم اس کی اجازت کے بغیر اس گھر میں گھس بھی نہیں سکتے، اور پھر ہمیں کیا پڑی ہے، یونہی مصیبت میں پڑنے کی۔"

"ہوں، میں تو اس زندگی سے تنگ آگیا ہوں۔" شوکت بولا۔

"ہوسکتا ہے، تمہاری خواہش پوری ہو ہی جائے۔"

"خدا کرے، وہ دن جلد آئے۔"

ٹیکسی سے اتر کر وہ کچھ دور تک پیدل چلتے رہے، پھر اپنے سردار کے گھر کے پاس پہنچے۔ اس وقت شام کے پونے آٹھ بج رہے تھے۔ سردار اپنے مخصوص کمرے میں تھا اور اس وقت بھی نقاب اوڑھے ہوئے تھا۔

"کہو، وہ شیشے کا ٹکڑا لائے یا آج بھی کل کی طرح ناکام لوٹے ہو۔"

"جی ہاں۔" شوکت کے منہ سے نکلا۔

"کیا مطلب؟"

"جی، وہ دراصل ......"

"کیا بات ہے، صاف صاف کہو۔"

آخر اسے پوری بات بتانا پڑی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ٹکڑا اس وقت انسپکٹر جمشید کے لڑکوں کے پاس ہے۔"

"جی ہاں۔"

"بہت بے وقوف ہو تم دونوں۔ اب ٹکڑا حاصل کرنا بہت مشکل ہوگا۔"

"ہم آج رات اسے حاصل کر لیں گے۔" تنویر بولا۔

"بکواس، تمہارے فرشتے بھی اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ اب تو مجھے ہی چلنا پڑے گا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک بٹن دبایا۔ ایک نوجوان فوراً ہی اندر داخل ہوا، جو شکل صورت سے کوئی شریف آدمی نہیں دکھائی دیتا تھا۔

"فوراً پانچ آدمی میرے ساتھ چلنے کی تیاری کریں۔ ہر طرح سے تیار۔" نقاب پوش نے اسے حکم دیا۔

"جی بہتر۔" وہ نوجوان کمرے سے نکل گیا۔

"تمہارے پاس پستول ہیں نا؟" نقاب پوش نے شوکت اور تنویر سے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"ٹھیک ہے۔"

اسی وقت پانچ آدمی اندر داخل ہوئے۔

"بہت خوب، یہ دونوں بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔" سردار نے شوکت اور تنویر کی طرف اشارا کیا۔

آٹھوں بدمعاش ایک بڑی سی کار میں بیٹھ کر انسپکٹر جمشید کے گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔

"میں کار میں باہر بیٹھوں گا اور تم لوگ میری ہدایت پر عمل کرو گے۔" سردار نے راستے میں کہا۔

"جی بہتر۔" دو تین آوازیں ابھریں۔

"ارے، یہاں تو بہت سی کاریں موجود ہیں۔ یہ کیا چکر ہے۔" انسپکٹر جمشید کے گھر کے پاس پہنچ کر سردار کے منہ سے نکلا۔

"کوئی گڑبڑ لگتی ہے۔" کسی نے کہا۔

"گاڑی یہیں روک دو۔" سردار نے ایک تاریک گوشہ دیکھ کر کہا۔ یہ جگہ انسپکٹر جمشید کے گھر سے کسی قدر فاصلے پر تھی۔ گاڑی رکنے کے بعد سردار نے ہدایات دینا شروع کیں۔

"تین آدمی بائیں باغ والی کھڑکی کے ذریعے اندر جا کر حالات کا جائزہ لیں اور دو آدمی دروازے کے سامنے پہرہ دیں گے۔ دو مکان کے پچھلی طرف نگرانی کریں گے کہ پچھلی طرف سے مکان میں داخل ہونے کا کوئی راستہ ہے یا نہیں۔"

شوکت اور تنویر ایک تیسرے ساتھی جاوید کے ساتھ باغ والی

کھڑکی کی طرف بڑھے۔ انہوں نے کھڑکی کو آہستہ سے دھکیلا، لیکن وہ اندر سے بند تھی۔

"سردار کھڑکی اندر سے بند ہے۔" شوکت نے آ کر بتایا۔

"صدر دروازے کو دیکھو، وہ بھی بند ہو تو پچھلی طرف سے مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرو۔"

وہ تینوں صدر دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازہ کھلا تھا۔ وہ بے دھڑک اندر داخل ہو گئے۔ ساتھ ہی ان کے پستول جیبوں سے نکل کر ہاتھوں میں آ گئے۔ برآمدہ طے کرنے کے بعد وہ جس کمرے کے پاس پہنچے، اس کا دروازہ کھلا تھا اور اس میں محمود، فاروق اور بیگم جمشید بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ ان تینوں کو دیکھ کر گھبرا گئے۔

"خبردار، کسی کے حلق سے آواز نہ نکلے۔" شوکت نے کہا۔

اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا پستول ان کی طرف تن گیا۔

وہ دم بخود رہ گئے۔ آخر بیگم جمشید بولیں۔

"کون ہو تم لوگ، اور اس طرح مکان میں کیوں گھسے؟"

"تمہارے بیٹے ہمیں جانتے ہیں اور اب یہ ہمیں بتائیں گے کہ وہ شیشے کا ٹکڑا کہاں ہے؟"

"شیشے کا ٹکڑا؟" بیگم جمشید کے منہ سے حیرت کی زیادتی کی وجہ سے نکلا۔ ان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"ہاں، شیشے کا ٹکڑا۔"

"وہ ہمارے پاس نہیں ہے۔" محمود نے کہا۔

"اگر تم نے دس منٹ کے اندر اندر نہ بتایا تو ہم تمہاری والدہ کو گولی مار دیں گے۔" اس کے ساتھ ہی تین پستول بیگم جمشید کی طرف اٹھ گئے۔

○

"وہ ٹکڑا رحیم اڑا کر لے جا چکا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" آئی جی صاحب تیز لہجے میں بولے: "ایک چپراسی کو بھلا اس ٹکڑے کی کیا ضرورت ــــ کہیں ہمیں دھوکا تو نہیں دے رہے ہو۔"

"دھوکا۔" انسپکٹر جمشید دھک سے رہ گئے۔ یہ ان کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ تھا کہ انہیں دھوکے باز خیال کیا جا رہا تھا، جب کہ اس محکمے میں انہوں نے کئی مرتبہ اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔

"ہاں، تم ملک سے غداری کر رہے ہو۔ غالباً تمہیں معلوم ہو گیا ہے کہ اس شیشے کے بکس میں کیا چیز ہے۔" آئی جی کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو رہی تھیں۔

"شیشے کا بکس، تو کیا وہ بکس ہے؟"

"بس، زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم جانتے ہو کہ اس بکس میں ایک بم بنانے کا فارمولا موجود ہے، جسے دشمن کافی بھاری قیمت دے کر خرید سکتی ہے۔"

"بم کا فارمولا، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" انسپکٹر جمشید ہکا بکا رہ گئے۔

"ہاں، اب بتاؤ۔ ایک چپراسی کو اسے چرانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اس کی وجہ موجود ہے۔" انسپکٹر جمشید نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"وہ کیا؟"

اس پر انسپکٹر جمشید نے اس وقت تک جو کچھ معلوم ہوا تھا، دہرانا شروع کر دیا۔

"رحیم اور چوکیدار کو آج سے چھ سال پہلے ملازم رکھا گیا تھا۔ سردار صاحب نے اپنے کسی دوست خان جبار کے کہنے پر انہیں ملازم رکھا تھا۔ کوئی نامعلوم شخص پہلے سے ہی ان دونوں سے مجرمانہ کام کراتا رہا ہے۔ بہرحال چپراسی ہمارے قبضے میں ہے اور وہ اس بات کی تصدیق کرے گا کہ اس سے پہلے بھی وہ دونوں اسی قسم کے کام کرتے رہے ہیں۔"

"اگر یہ بات مان بھی لی جائے، تب بھی یہ ذمہ داری تمہاری تھی کہ اسے بحفاظت رکھتے۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اس حد تک اہم چیز ہوگی ؛ بہرحال میں اسے دوبارا حاصل کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ اسے دوبارا جلد ہی آپ کی خدمت میں پیش کر سکوں گا۔"

"کاش، وہ بکس مل جائے، تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ اگر وہ دشمن کے ہاتھوں میں پہنچ گیا تو قوم کو کس قدر تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔"

"مجھے اس کا شدید احساس ہے اور بے حد افسوس ہے۔"

فرزانہ نے یہ سب باتیں سنی تھیں اور اب اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

"ابا جان۔" وہ باہر سے چلائی۔ کمرے میں موجود تمام افسر چونک اٹھے۔ کئی ایک کے چہروں پر ناگواری نظر آئی۔

"فرزانہ، جاؤ اپنے کمرے میں۔" انسپکٹر جمشید نے غصے سے کہا۔

"مجھے ایک ضروری بات کہنی ہے۔"

"فرزانہ جاؤ، ورنہ بہت بری طرح ماروں گا۔" انہیں تاؤ آ گیا۔

"ابا جان وہ بات شیشے کے اس بکس کے بارے میں ہے۔" آخر فرزانہ کو سب پر ظاہر کرنا پڑا۔

"کیا؟" ان سب کے منہ سے نکلا۔

پھر وہ سب ایک ساتھ دروازے کی طرف دوڑ پڑے۔

○

"ایک — دو — تین — چار — پانچ۔" شوکت گننے لگا۔ محمود فاروق اور بیگم جمشید کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔

"ٹھہرو۔" آخر بیگم جمشید نے کہا۔ گننے والا ٹھہر گیا۔

"پہلے میں ان سے معلوم تو کر لوں کہ بات کیا ہے۔" انہوں نے کہا۔

"یہ دونوں جانتے ہیں — اور اگر انہیں تمہاری زندگی عزیز ہے تو فوراً ہی بتا دیں گے۔" شوکت نے کہا۔

"وہ ٹکڑا آپ کی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہے امی جان۔ نہ ہی ہمیں معلوم ہے کہ وہ ہے کیا بلا — اس لیے ہم وہ ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ٹھہرو، میں تمہیں ابھی لا کر دیتا ہوں۔" محمود اٹھ کر جانے لگا۔

"ٹھہرو، ہم سب ساتھ جائیں گے۔"

"ہرگز نہیں، محمود تم وہ ٹکڑا ان کے حوالے نہیں کرو گے۔" بیگم جمشید اٹل لہجے میں بولیں۔

"ہمیں آپ کی زندگی بھی تو عزیز ہے امی جان۔ وہ ٹکڑا اس

وقت میرے کمرے .....؛

"بے وقوف خاموش ہو جا" بیگم جمشید تیزی سے بولیں۔
لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔

"ٹھیک ہے، فوراً تینوں اٹھو اور کمرے میں چلو"

مجبوراً تینوں اٹھ کھڑے ہوئے ۔۔ وہ تینوں آگے آگے تھے۔
شوکت، تنویر اور جاوید پستول تانے ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔
پھر وہ محمود اور فاروق کے کمرے میں داخل ہو گئے۔ عین اسی وقت
بہت سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ چونک کر مڑے۔ دروازے
کی طرف آٹھ نو آدمی دوڑے آ رہے تھے۔ فرزانہ ان سب سے آگے
تھی۔ وہ کمرے سے صرف چند قدم کے فاصلے پر رہ گئے تھے۔
شوکت اور اس کے ساتھی گھبرا گئے ۔۔ اچانک تنویر چلایا۔

"شوکت، دروازہ بند کر دو"

شوکت نے گویا ہوا میں اڑتے ہوئے دروازہ اندر سے بند کر
لیا۔ انسپکٹر جمشید نے دروازہ بند ہوتے دیکھا تو دائیں طرف والی
کھڑکی کی طرف دوڑے، لیکن اتنی دیر میں تنویر کھڑکی بند کر چکا
تھا۔ اب حالات کچھ اس طرح تھے:

فرزانہ اور انسپکٹر جمشید باقی ماندہ آفیسرز کے ساتھ کمرے
کے تینوں طرف موجود تھے۔ جب کہ محمود، فاروق اور ان کی امی
تین عدد مجرموں کے ساتھ اس کمرے میں بند تھے، جس میں شیشے کا بکس

موجود تھا اور ان تینوں کے پستول ان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔
مجرموں کا سردار اور باقی ساتھی اس سچویشن سے بے خبر مکان سے
باہر موجود تھے؛

○

تھوڑی دیر کے لیے پورے مکان میں موت کی سی خاموشی
چھا گئی تھی ۔۔ ان سب کے دل دھک کر رہے تھے اور وہ بتوں
کی مانند ساکت و جامد کھڑے تھے۔ آخر سب سے پہلے انسپکٹر جمشید
کو ہوش آیا۔

"دروازہ کھول کر خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ تم بچ کر
نہیں جا سکتے۔ مکان چاروں طرف سے گھر چکا ہے" وہ اونچی آواز
میں بولے۔ کچھ دیر تک اندر سے جواب نہ آنے پر پھر بولے:

"اگر تم نے دروازہ نہ کھولا تو توڑ دیا جائے گا"

"اگر کسی نے دروازہ توڑنے کی کوشش کی تو دونوں بچوں
اور ان کی والدہ کو گولیوں سے اڑا دیا جائے گا" اندر سے آواز آئی:
"یہ تینوں اس وقت تین پستولوں کی زد میں ہیں، اگر ان کی زندگی
عزیز ہے تو کوئی دروازہ توڑنے کی کوشش نہ کرے"

"محمود، کیا ان لوگوں کے پاس پستول ہیں؟" اچانک انسپکٹر جمشید

نے پوچھا۔

"جی ہاں" اندر سے محمود کی آواز آئی۔

"تم گھبرانا نہیں — یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے" انہوں نے تینوں کو دلاسا دیا۔

"آپ ہماری فکر نہ کریں ابا جان، صرف یہ بتا دیں کہ شیشے کا ٹکڑا ہے کیا بلا؟" فاروق نے پوچھا۔

"خاموش رہو — خبردار، اگر اب تم نے زبان ہلائی" اندر شوکت نے انہیں ڈانٹ دیا۔

"وہ شیشے کا ٹکڑا نہیں، بلکہ ایک چھوٹا سا بکس ہے اور اس میں ایک بم کا فارمولا ہے۔ اگر یہ دشمن کے ہاتھ لگ گیا تو ہم کہیں کے نہیں رہیں گے" انسپکٹر جمشید نے انہیں بتایا۔

"تب آپ فکر نہ کریں، اب ہم مطمئن ہیں۔ وہ بکس ہماری جانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ یہ ہمیں شوٹ کرتے ہیں تو کریں، لیکن شیشے کا بکس نہ ہاتھ سے جانے پائے گا" بیگم جمشید کی پروقار آواز آئی۔

"بہت خوب، خدا تمہاری حفاظت کرے"

"آمین" کئی ایک کے منہ سے نکلا۔

"گھبرانا نہیں، ہم اس کمرے کے تینوں طرف موجود ہیں اور ہم سب ریوالوروں سے مسلح ہیں"

"آپ اپنا کام کریں۔ اندر کا معاملہ ہم پر چھوڑ دیں" محمود نے کہا۔

"اچھا، اب میں تمہیں اپنی مرضی پر چھوڑتا ہوں، جو تمہارے جی میں آئے کرو، لیکن یاد رکھو تمہیں ملک اور قوم کی بقا سے زیادہ کسی چیز کی پروا نہیں ہونی چاہیے۔ تمہیں مر کر بھی شیشے کا بکس ان کے حوالے نہیں کرنا ہے" انسپکٹر جمشید کی آواز بھرا گئی۔

"بے فکر رہیں ابا جان"

"اچھا خدا حافظ"

"خدا حافظ"

کمرے کے اندر

"بس اب ڈائیلاگ بہت ہو چکے۔ خبردار اگر اب تم نے کسی بات کا جواب دیا۔ ہاں، اب بتاؤ، وہ شیشے کا بکس کہاں ہے؟" شوکت نے غرا کر پوچھا۔

"کون سا بکس؟" محمود نے دلیر ہو کر کہا۔

"بہت خوب، تم نہیں بتاتے نہ بتاؤ۔ ہم ابھی اسے برآمد کر لیتے ہیں۔ تنویر تم ان کی طرف پستول تانے رہو۔ میں اور جاوید کمرے کی تلاشی لیں گے۔" شوکت نے کہا۔

"اچھا۔" تنویر کی نگاہیں ان پر جم گئیں۔

دونوں کمرے کی چیزیں الٹ پلٹ کرنے لگے۔ کپڑوں کی الماری، کتابوں کی الماری، صندوق، میز کی درازیں غرض ہر چیز انہوں نے دیکھ ڈالی مگر شیشے کا بکس کہیں نہ ملا۔ صرف دو الماریاں رہ گئیں۔ یہ محمود اور فاروق کی تھیں۔

"کیوں، مل گیا؟" فاروق ہنسا۔

"خاموش رہو۔" تنویر نے کہا۔

"دیکھو، اب بھی بتا دو، ورنہ ہم سختی سے پیش آئیں گے۔" شوکت نے کہا۔

"تو کیا اب تک تم نرمی سے پیش آتے رہے ہو؟" محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں۔"

"تو ٹھیک ہے، ہم تمہاری سختی کا نمونہ بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔" فاروق بول اٹھا۔

"بہت زبان چل رہی ہے تمہاری۔ ابھی ساری تیزی دھری رہ جائے گی۔"

"دیکھا جائے گا۔ تم بھول رہے ہو کہ مکان چاروں طرف سے گھرا ہوا ہے اور اس کمرے کے ارد گرد بھی میرے والد اور دوسرے لوگ موجود ہیں۔" محمود نے انہیں یاد دلایا۔

"اس کمرے کے باہر تمہارے والد اور ان کے ساتھی ضرور موجود ہیں، لیکن مکان کے باہر تمہارا کوئی آدمی موجود نہیں۔ یہ بات غلط ہے کہ مکان گھیرے میں لیا جا چکا ہے۔"

"یہ غلط نہیں ہو سکتا۔ کیا تم نے سنا نہیں میرے ابا جان کیا کہہ رہے تھے۔"

"میں نے سنا تھا اور دل میں ان کے جھوٹ پر ہنسا بھی تھا۔"

"کیا مطلب؟" محمود اور فاروق چونکے۔

"مطلب یہ کہ اس مکان کے چاروں طرف دراصل ہمارے ساتھی ضرور موجود ہیں۔ اگر پولیس آئی ہوتی تو اس وقت تک دونوں طرف سے گولیاں ضرور چلی ہوتیں، کیا سمجھے؟ اب سنو، اس کمرے سے باہر تمہارے والد اور ان کے ساتھی موجود ہیں۔۔۔ جب کہ کمرے کے اندر تین ہم ہیں اور مکان کے باہر بھی ہمارے ساتھی موجود ہیں۔ اب تم لوگوں کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ وہ بکس ہمارے حوالے کر دو۔ تمہاری جانیں بچنے کی یہی ایک صورت ہے۔"

"ہمیں اپنی جانوں کی پروا نہیں۔" محمود نے کہا۔

"ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

"زندگی اور موت خدا کے ہاتھ ہے۔" بیگم جمشید نے کہا۔

"تو تم نہیں بتاؤ گے؟"

"نہیں۔"

"اچھا، تنویر ذرا چاقو نکالنا۔۔۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس میں کتنا دم خم ہے۔" شوکت نے اپنے ساتھی سے کہا۔۔۔ اس نے چاقو نکال کر شوکت کو پکڑا دیا۔

"دیکھو لڑکے، اگر تم نہیں بتاؤ گے تو یہ چاقو تمہاری پنڈلی میں اتر جائے گا۔"

"بس۔" محمود نے اس کا مذاق اڑایا۔

"اس پر بھی نہیں بتاؤ گے تو تمہارے بھائی کی پنڈلی میں بھی اتار دیا جائے گا۔"

"بھئی واہ، مزا آ گیا۔" فاروق ہنسا۔

"اور اس کے بعد تمہاری والدہ کی باری آئے گی۔" شوکت نے افسوس ناک لہجے میں کہا۔

"ہم اسی ماں کی اولاد ہیں بے وقوف۔" محمود نے تیز لہجے میں کہا۔

"بڑی بی، کیا تم اپنے بیٹوں کی پنڈلیوں میں چاقو اترتے دیکھ سکو گی؟"

"کیوں نہیں، یہ نظارا میرا دل باغ باغ کر دے گا۔ اس سے بڑھ کر میرے لیے کیا خوشی کی بات ہو سکتی ہے کہ میرے کم سن بیٹوں نے وطن کی خاطر ہنس کر زخم کھائے ہیں۔"

"تو پھر خوش ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" شوکت یہ کہہ کر آگے بڑھا۔۔۔ تینوں کی نظریں اس کے چاقو پر گڑی ہوئی تھیں۔

"اب بھی وقت ہے۔۔۔ کیوں اپنا خون مفت میں ضائع کرتے ہو۔" شوکت نے محمود کے قریب پہنچ کر کہا۔

"اس خون کا اس سے اچھا استعمال اور کیا ہو گا۔" محمود نے کہا۔

"تو یہ لو۔" شوکت نے غصے میں آ کر چاقو والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔ پھر ہاتھ تیزی سے نیچے جھکا:

"ٹھہرو دوست!" اچانک فاروق بول اٹھا۔ شوکت کا ہاتھ رک گیا۔

"کہو، کیا ہے؟"

"تم غلطی کر رہے ہو۔" فاروق نے کہا۔

"کیا مطلب؟"

"شیشے کے بکس کے متعلق محمود کو تو معلوم ہی نہیں ۔۔ وہ تو دراصل میرے ہاتھ کا رکھا ہوا ہے، لہٰذا تم یہ چاقو میری پنڈلی میں اتار دو، تاکہ میں تمہیں فوراً ہی بتا دوں۔" فاروق نے مسکرا کر کہا۔

"بہت خوب، مجھے کیا معلوم تھا کہ بکس تمہارا رکھا ہوا ہے۔" شوکت نے کہا اور فاروق کی طرف بڑھا۔

"یہ غلط کہتا ہے، اسے معلوم ہی نہیں کہ بکس کہاں رکھا ہے۔" محمود چلایا۔

"کیا بکواس ہے۔" شوکت جھنجلا اٹھا۔

"میں سچ کہتا ہوں۔ بکس میں نے رکھا ہوا ہے۔" محمود نے کہا۔

"کہاں؟" شوکت نے تیزی سے پوچھا۔

"مجھے افسوس ہے۔ یہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"اسے معلوم ہی نہیں تو بتائے گا کیا۔" فاروق مسکرایا۔

"تم دونوں پاگل معلوم ہوتے ہو۔"

"ہم تو نہیں ہیں؛ البتہ تمہیں ضرور پاگل کر دیں گے۔" فاروق نے پھر مسکرا کر کہا۔

"تم یوں نہیں مانو گے ۔۔ اب چاقو چلانا ہی پڑے گا۔" یہ کہہ کر

شوکت ایک بار پھر محمود کی طرف مڑا ۔۔ جوں ہی اس کے نزدیک پہنچا، فاروق چلایا:

"میں بتاتا ہوں، بکس کہاں ہے۔"

"اب ہم تمہاری ایک نہیں سنیں گے۔"

"اگر تم ہماری ایک نہیں سنو گے تو شیشے کا بکس بھی تمہیں نہیں ملے گا۔" فاروق بولا۔

"اچھا بتاؤ، کہاں ہے؟"

"میری الماری میں ۔۔ وہ رہی میری الماری ۔۔ تم نے ابھی تک اس الماری میں تو دیکھا ہی نہیں۔" فاروق نے کہا۔

محمود سمجھ گیا کہ فاروق ان کا وقت ضائع کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس کی مدد کو بولا:

"یہ تم نے کیا کیا فاروق؟"

"تو کیا اپنی پنڈلیوں میں سوراخ کرا لوں۔" فاروق بولا۔

شوکت اور اس کا ساتھی تیزی سے الماری کی طرف بڑھے۔ تنویر اب بھی ان پر پستول تانے ہوئے تھا۔ شوکت نے الماری ہینڈل پکڑ کر کھینچا، لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔

"یہ تو بند ہے۔" شوکت بولا۔

"اچھا، اوہ ۔۔ مجھے یاد آیا۔ اس میں تو تالا لگا ہوا ہے۔" فاروق نے جواب دیا۔

"لاؤ، چابی دو۔"

"چابی، چابی تو باہر دوسرے کمرے میں ہے۔ کیا میں جا کر لے آؤں؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"بکو مت، چابی ضرور تمہاری جیب میں ہوگی۔"

"تو جیب کی تلاشی لے لو۔"

شوکت نے باری باری تینوں کی جیبوں کی تلاشی لی، لیکن کوئی چابی برآمد نہ ہوئی۔

"الماری کا تالا پستول کی گولی سے توڑ دو۔" شوکت نے تنویر سے کہا۔

تنویر آگے بڑھا۔ اس نے پستول کی نال تالے کے سوراخ پر رکھ کر فائر کر دیا۔

کمرے کے باہر

فائر کی آواز نے ان سب کو چونکا دیا۔ انسپکٹر جمشید کا منہ فق ہوگیا۔ وہ پوری قوت سے چلائے۔

"محمود، کیا ہوا؟" فرزانہ کی بھی خوف سے چیخ نکل گئی۔

"ہم خیریت سے ہیں اباجان۔ انہوں نے الماری کا تالا توڑا ہے۔"

"اوہ اچھا۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے پرسکون آواز نکلی۔

اس وقت تک انسپکٹر جمشید تین آفیسروں کو دائیں طرف والی کھڑکی پر اور تین کو بائیں طرف والی کھڑکی پر مقرر کر چکے تھے اور خود آئی جی اور ڈی آئی جی صاحبان کے ساتھ دروازے پر موجود تھے۔ ان کے پاس ہی فرزانہ کھڑی تھی۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ کیا کیا جائے۔" ڈی آئی جی صاحب بولے۔

"کیوں نہ پولیس کی ایک پوری جمعیت منگالی جائے۔" آئی جی

صاحب نے مشورہ دیا۔

"وہ کیسے ؟"

"یہاں کسی جگہ سے فون کیا جا سکتا ہے ؟"

"ہاں، ساتھ والی کوٹھی سے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"تو ٹھیک ہے، تم جا کر فون کر آؤ۔" آئی جی صاحب نے کہا۔

"لیکن پولیس یہاں آ کر کیا کرے گی۔ دشمن تین ہیں اور ہم ان کے مقابلے میں نو دس ہیں۔ ایک بات طے ہے کہ اگر انہوں نے شیشے کا بکس حاصل کر لیا۔ تو ہم انہیں کسی قیمت پر بھی نہیں جانے دیں گے۔ وہ میرے بیوی بچوں کی زندگی کی دھمکی دیں گے نا..... پروا نہیں، میں ان کی قربانی دے کر بھی مسکرا سکوں گا کہ میرے دو بیٹے اور بیوی قوم اور ملک پر قربان ہو گئے۔" انسپکٹر جمشید جذباتی ہو گئے۔

"وہ تو سب ٹھیک ہے، لیکن میں پھر بھی یہ خیال کرتا ہوں کہ پولیس منگوالی جائے۔ اس طرح پورے مکان کو گھیرے میں لیا جا سکے گا۔ آئندہ خدا جانے کیا حالات پیش آئیں۔ ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

"جی بہتر، میں جا کر فون کیے دیتا ہوں، آپ چوکس رہیں۔"

"تم اس طرف سے بے فکر رہو ــــ یا پھر تم فرزانہ کو کیوں نہیں بھیج دیتے۔" ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔

"ہاں، یہ ٹھیک رہے گا۔ فرزانہ، تم شیرازی صاحب کے گھر جاؤ اور پولیس سٹیشن فون کر کے میری طرف سے کہو، فوراً ایک لاری میں آ جائیں۔"

فرزانہ دروازے کی طرف بڑھی، پھر وہ باہر نکل آئی۔ گلی میں بجلی کا بلب روشن تھا اور اس کی روشنی میں گلی میں کھڑی کاریں صاف دیکھی جا سکتی تھیں ــــ اچانک اس نے دو آدمیوں کو ایک کار کی طرف بڑھتے دیکھا، پھر وہ اس کار پر تھوڑا سا جھکے اور ان میں سے ایک بولا:

"پچھلی طرف سے مکان میں داخل ہونے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

"شوکت اور اس کے دونوں ساتھی تو اندر داخل ہو چکے ہیں نا۔" کار میں کسی نے کہا۔

"جی ہاں۔"

"تو ٹھیک ہے، میں نے ابھی ابھی ایک دھماکے کی آواز سنی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مکان کے اندر کوئی فائر ہوا تھا۔ تم ایسا کرو کہ ایک آدمی اندر جا کر حالات معلوم کر آئے اور ایک پچھلی طرف چلا جائے۔ دروازے کے سامنے وہ دونوں پہلے ہی موجود ہیں۔"

دروازے پر موجود دو آدمیوں کا ذکر سن کر فرزانہ چونکی۔

اب اس نے ان دونوں کو دیکھا، وہ اس کے بالکل سامنے تھے، لیکن ابھی تک ان دونوں نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ کار کی طرف دیکھ رہے تھے، کسی بھی لمحے وہ اسے دیکھ سکتے تھے۔ اس خیال سے ہی وہ گھبرا گئی، کیونکہ اس طرح فون کرنے کا پروگرام درہم برہم ہو سکتا تھا۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً زمین پر لیٹ گئی اور جھاڑیوں باڑ کے ساتھ ساتھ پیٹ کے بل رینگنے لگی۔ یہ باڑ شیرازی صاحب کے دروازے تک چلی گئی تھی۔ باڑ کے پاس جگہ نیم تاریک تھی۔ اس نے اسی تاریکی سے فائدہ اٹھایا اور آگے بڑھتی رہی۔ یہاں تک کہ شیرازی صاحب کے دروازے تک پہنچ گئی۔ اب مسئلہ تھا، دروازہ کھولنے کا — اس نے لیٹے لیٹے دروازے کو تھوڑا سا دھکیلا، دروازہ کھلتا چلا گیا۔ ساتھ ہی ہلکی سی چرچراہٹ بھی ہوئی — گلی میں کھڑے ہوئے دونوں آدمی چونک اٹھے۔

"یہ کیسی آواز تھی ؟"

"ایسا معلوم ہوتا ہے، جیسے کوئی دروازہ کھلا ہو۔"

"کون سا دروازہ ؟"

"آواز اس طرف سے آئی تھی۔" ایک نے شیرازی صاحب کے دروازے کی طرف اشارا کیا۔

"جا کر دیکھو — ہو سکتا ہے، کوئی گڑبڑ ہو۔"

"اچھا۔" وہ شیرازی صاحب کے دروازے کی طرف بڑھا — فرزانہ ابھی تک دروازے کے باہر زمین پر لیٹی تھی۔ مجرموں کا ساتھی لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہا تھا۔ فرزانہ کے پاس اس وقت دو ہی راستے تھے۔ یا تو فوراً دروازے میں داخل ہو جائے یا پھر تیزی سے رینگتے ہوئے باڑ کے برابر لیٹ جائے۔ اسے مکان کے اندر داخل ہونا مناسب معلوم ہوا — دوسرے ہی لمحے وہ کسی مگرمچھ کی طرح رینگتی ہوئی اندر داخل ہو چکی تھی۔ دروازہ تھوڑا سا اور کھل گیا تھا — اندر داخل ہوتے ہی وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی — اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

"کوئی اندر داخل ہوا ہے۔" باہر سے آواز آئی۔

"تو تم بھی اندر گھس جاؤ اور جو کوئی بھی اندر گیا ہے، اسے باہر لے آؤ۔"

ایک بار پھر دروازہ کھلا اور کوئی اندر داخل ہوا — برآمدے میں تاریکی تھی۔ وہ سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا، جب کہ فرزانہ ابھی تک دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اب وہ نہ اندر جا سکتی اور نہ باہر —

ایک دوسرے کے پاس پہنچے۔

"کیا وہ تمہیں اندر ملی۔" انسپکٹر جمشید کے گھر سے نکلنے والا بولا۔

"کون؟"

"انسپکٹر جمشید کی لڑکی اس گھر میں فون کرنے داخل ہو چکی ہے۔"

"ارے، مگر مجھے تو اندر کوئی بھی نہیں ملا۔"

"تم بے وقوف ہو۔ اگر وہ فون کرنے میں کامیاب ہو گئی، تو ہم سب مارے جائیں گے۔ فوراً اندر داخل ہو جاؤ۔ میں بھی سردار کو اندر کے حالات بتا کر تمہارے پیچھے آتا ہوں۔"

وہ گھبراہٹ کے عالم میں شیرازی صاحب کے دروازے کی طرف بڑھا۔ دوسرا سردار کی کار کی طرف تیر کی طرح آیا، لیکن یہ کیا؟ شیرازی کے گھر کے دروازے پر ان کا ساتھی کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ وہ اندر داخل نہیں ہوا۔ یہ دیکھ کر دوسرے نے پوچھا:

"کیا بات ہے، تم اندر کیوں نہیں جاتے۔"

"دروازہ اندر سے بند ہو چکا ہے۔"

"کیا کہا، دروازہ بند ہو گیا ہے۔"

"ہاں۔"

"تب تو مر گئے بے موت۔" اس کے منہ سے نکلا۔

"کیا بات ہے، کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔" سردار نے تنگ آکر پوچھا۔

"گڑبڑ ہو گئی سردار۔"

"کیا مطلب؟"

"اندر ہمارے تینوں ساتھی ایک کمرے میں انسپکٹر جمشید کے بیٹوں کے ساتھ بند ہیں۔ باہر انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھی موجود ہیں۔ شیشے کا بکس اسی بند کمرے میں موجود ہے۔ ادھر انسپکٹر جمشید کی لڑکی پولیس کو فون کرنے کے لیے ساتھ والے مکان میں داخل ہو چکی ہے۔ وہ اندر ہمارے ساتھی کو نظر نہیں آئی۔ اور وہ باہر نکل آیا۔ اب اس کے باہر نکلتے ہی اس چالاک لڑکی نے دروازہ اندر سے بند کر لیا ہے۔"

"بے وقوف ہو تم سب۔ اب فوراً کسی پائپ کے ذریعے مکان کے اندر داخل ہو جاؤ۔ خبردار، وہ لڑکی ہرگز فون نہ کرنے پائے۔"

دونوں شیرازی صاحب کے مکان کی طرف دوڑے۔

پھر سانپ

شوکت پستول کی مدد سے الماری کا تالا توڑنے میں کامیاب ہو گیا تھا، لیکن پوری الماری چھان مارنے پر بھی انہیں شیشے کا ٹکڑا نہیں ملا۔

"تو تم نے جھوٹ بولا تھا۔" شوکت فاروق کی طرف مڑا۔

"کیا مطلب ؟" فاروق نے لاپروائی سے کہا۔

"تمہاری شامت آئی ہے۔" شوکت نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

"اچھا، کہاں ہے، میں خود اس سے ملنے کے لیے بے چین ہوں۔"

"بکو مت، تم آسانی سے نہیں بتاؤ گے۔ اب ہمیں سختی کرنا ہی پڑے گی۔"

"جی ہاں، اب تک آپ بہت ہی نرم مزاج ثابت ہوئے ہیں۔" فاروق نے معصومیت سے کہا۔

"بہت زبان چل رہی ہے۔"

"اگر آپ کو میری آواز بُری لگتی ہے تو اب نہیں بولوں گا۔"

"ذرا سی دیر میں ساری شوخی نکل جائے گی۔"

"اچھا، آپ نجومی بھی ہیں۔" فاروق ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔

"اس بار ہم تمہاری امّی کی طرف سے شروع ہوں گے۔"

"میں انہی کی والدہ ہوں ۔۔ تمہیں یہ غلط فہمی کیسے ہوگئی کہ مجھ پر سختی کرنے سے تم شیشے کا بکس حاصل کر لو گے۔"

"ابھی معلوم ہوا جاتا ہے ۔۔ چلو، تم اپنے چاقو کا کمال دکھاؤ۔" شوکت نے جاوید سے کہا۔

"ہاں، یہ اپنے کمالات دکھا چکے ہیں۔ اب تم شروع ہو جاؤ۔" فاروق ہنسا۔

جاوید چاقو لے کر بیگم جمشید کی طرف بڑھا ۔۔ محمود اور فاروق مضطرب ہو کر انہیں دیکھنے لگے۔ جوں ہی اس کا چاقو والا ہاتھ بلند ہوا، محمود بول اٹھا :

"یار فاروق، میرا خیال ہے کہ اب انہیں بتا ہی دینا چاہیے۔"

"کیوں، نکل گئی ساری بہادری ۔۔"

"میں بتاتا ہوں ۔۔ تم اپنے ساتھی کو واپس بلاؤ۔"

"نہیں، وہ وہیں رہے گا ۔۔ بتانا ہے تو فوراً بتاؤ۔"

"خبردار محمود، اگر تم نے بتایا تو زندگی بھر تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

"امی جان، میں آپ کا خون زمین پر گرتے نہیں دیکھ سکتا۔" محمود نے کہا۔

"تو اپنی آنکھیں بند کر لو۔"

"امی جان!" محمود کی آواز بھرا گئی۔

"وہ بکس میری جان سے زیادہ قیمتی ہے۔"

"مجبوری ہے امی جان، اور پھر بکس اگر انہیں مل بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔" محمود نے کہا۔

"نہیں، بزدلی کی ابتدا اس کمرے سے نہیں ہونی چاہیے۔"

"بہت اچھا امی جان، آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔" محمود نے بے چارگی سے کہا۔

شوکت کے ساتھی کا ہاتھ ایک بار پھر اٹھا:

"ٹھہرو بھئی، ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ تم بھی اسی کمرے میں ہو اور ہم بھی کہیں بھاگے تو جا نہیں رہے۔ بتا دیں گے۔ کیوں فکر کرتے ہو۔" اس مرتبہ محمود غیر سنجیدہ ہو گیا۔ بیگم جمشید نے اسے حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔

"جلدی بتاؤ۔" شوکت نے تیز لہجے میں کہا۔

"ہاں ہاں، بتا رہا ہوں ــ شیشے کا بکس اس کمرے میں نہیں ہے،

بلکہ اس مکان میں ہی نہیں ہے۔"

"کیا؟ یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو۔" شوکت چلایا۔

"جو تم سن رہے ہو ــ یہاں سے بہت دور دریا کے بیچوں بیچ ایک بارہ دری ہے ــ اس بارہ دری کے نیچے ایک تہہ خانہ ہے۔ اس تہہ خانے میں ایک بہت بڑا اور بھاری لوہے کا صندوق رکھا ہے۔ اس بڑے صندوق میں ایک اس سے چھوٹا لوہے کا صندوق رکھا ہے۔ دونوں صندوقوں پر وزنی تالے لگے ہوئے ہیں۔ اس چھوٹے صندوق میں وہ شیشے کا بکس رکھا ہے۔ رات کے وقت کشتی بھی نہیں مل سکتی اور کشتی کے بغیر اس بارہ دری تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ اس لیے....."

"خاموش رہو۔" شوکت چلایا۔

"اگر تم بکس کا پتا معلوم نہیں کرنا چاہتے تو میں خاموش ہو جاتا ہوں۔" اس نے چہرے پر معصومیت طاری کر لی۔ بیگم جمشید اور فاروق کی ہنسی نکل گئی۔

"مجھے یقین ہے کہ بکس اسی کمرے میں ہے اور ہم خود ہی اسے تلاش کر لیں گے۔" بالآخر شوکت نے عاجز آ کر کہا:

"تنویر، تم پستول ان کی طرف تانے رہو ــ ہم دونوں ایک بار پھر اس پورے کمرے کی تلاشی لیں گے اور پھر ابھی تو ایک الماری دیکھنا باقی ہے۔"

دونوں نے کمرے کی ساری چیزوں کو پھر سے الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا۔ تینوں خاموشی سے انہیں دیکھتے رہے، پھر دفعتاً محمود گھبرا گیا۔ شوکت اب اس الماری کی طرف بڑھ چکا تھا جس کے اوپر والے خانے میں شیشے کا بکس موجود تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اوپر والے خانے کی چیزیں زمین پر گرانے لگا۔

"خبردار، الماری کے اس خانے کو ہاتھ نہ لگانا۔" وہ چلّایا۔

○

مجرموں کا ساتھی جوں ہی باہر نکلا، فرزانہ نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور اب وہ تیزی سے اندر جا رہی تھی۔ وہ اس مکان کو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ اندر سے دیکھ چکی تھی، اس لیے اسے فون والے کمرے تک پہنچنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھایا ہی تھا کہ ایک آواز نے چونکا دیا۔

"ٹھہرو، کون ہو تم —"

وہ مڑی، دروازے میں بیگم شیرازی کھڑی تھیں۔

"ارے فرزانہ تم — تم یہاں کیا کر رہی ہو؟"

"کیا بتاؤں آنٹی۔ اس وقت ہم سب مصیبت میں ہیں۔ میں یہاں پولیس سٹیشن کو فون کرنے آئی تھی۔ مجھے افسوس ہے کہ

بغیر اجازت ہی یہاں چلی آئی۔"

"کوئی بات نہیں۔ تم فون کر لو، پھر بتانا کیا بات ہے۔"

فرزانہ نے نمبر ڈائل کیے، لیکن لائن صاف نہیں تھی — وہ ریسیور کان سے لگائے انتظار کرتی رہی۔

"کیا بات ہے؟" بیگم شیرازی نے پوچھا۔

"لائن صاف نہیں ہے۔"

"ہوں، بات کیا ہے۔ تم بہت گھبرائی ہوئی ہو۔"

"ہم اس وقت دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے مکان کے اندر بھی دشمن ہیں اور باہر بھی۔"

"تب انہوں نے تمہیں یہاں کیسے آنے دیا؟"

"لمبی کہانی ہے، آپ کو تفصیل سے سناؤں گی۔" فرزانہ نے کہا اور ایک بار پھر نمبر ڈائل کرنے لگی، لیکن ابھی تک لائن صاف نہیں ہوئی تھی۔

"اُف اللہ، کیا مصیبت ہے۔"

"لاؤ، میں کوشش کرتی ہوں۔" بیگم شیرازی نے کہا۔ عین اسی وقت دھم کی آواز آئی۔ شاید کوئی کودا تھا — فرزانہ گھبرا گئی۔

"وہ آ گئے۔"

"کون آ گئے؟"

"دشمن، آپ فوراً اس کمرے کا دروازہ بند کر دیں۔"

بیگم شیرازی گھبراہٹ کے عالم میں دروازے کی طرف دوڑیں اور اندر سے دروازے کی چٹخنی لگا دی۔ فرزانہ لرزتے ہاتھوں سے نمبر ڈائل کرنے لگی۔ اچانک دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔

"دروازہ کھولو، ورنہ ہم توڑ دیں گے۔" باہر سے آواز آئی۔

بیگم شیرازی کو کھڑکی کا خیال آیا جو کھلی رہ گئی تھی۔ وہ اس طرف لپکیں، لیکن اسی وقت باہر والوں کو بھی عقل آ چکی تھی۔ وہ دونوں کھڑکی پھلانگتے ہوئے اندر چلے آئے اور عین اسی وقت نمبر مل گیا۔ دوسری طرف سے کسی نے پوچھا:

"ہیلو، کون بول رہا ہے؟"

ان میں سے ایک تیزی سے آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ فرزانہ کے منہ سے کوئی لفظ نکل سکتا۔ اس کے ہاتھوں سے ریسیور چھین کر کریڈل میں پٹخ دیا گیا۔

○

"ہم کب تک یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے کھڑے رہیں گے۔" آئی جی نے اکتا کر کہا۔

"ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔" ڈی آئی جی بولے۔

"فرزانہ بھی ابھی تک نہیں لوٹی۔" انسپکٹر جمشید فکرمند تھے۔

"یوں کام نہیں چلے گا۔ کچھ کرنا ہی ہوگا۔"

"کیا کیا جائے۔ اگر ہم اس کمرے کا دروازہ توڑنے کی کوشش کرتے ہیں تو تین جانیں ضائع ہوں گی۔" ڈی آئی جی نے کہا۔

"تین جانیں پوری قوم سے قیمتی تو نہیں ہیں۔" آئی جی صاحب

"یہ تو ٹھیک ہے جناب عالی، لیکن ابھی کوئی خطرناک قدم اٹھانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ مجرم بھی تو اندر بند ہیں اور جب تک وہ اس کمرے میں بند ہیں، ہمیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اب تو دیکھنا یہ ہے کہ وہ کیا قدم اٹھاتے ہیں۔"

"میں جانتا ہوں، وہ کیا کریں گے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"کیا کریں گے؟"

"شیشے کا بکس حاصل کرنے کے بعد وہ دروازے پر آ کر کہیں گے، تمہارے بیوی اور بچے ہمارے پستولوں کی زد میں ہیں، اگر کسی نے بھی حرکت کرنے کی کوشش کی تو ان تینوں کی لاشیں ہی ملیں گی۔"

"اس صورت میں بہت کچھ کرنے کا موقع مل سکتا ہے۔" ڈی آئی جی صاحب بولے۔

"ہاں، اس کے امکانات ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔"

"مگر فرزانہ ابھی تک کیوں نہیں آئی" انسپکٹر جمشید صرف یہی بات بار بار دہرا رہے تھے۔

"خدا جانے کیا بات ہے"

"کیوں نہ میں جا کر فرزانہ کو دیکھ آؤں"

"ہاں ہاں، دیکھ آؤ۔ ہم یہاں پوری طرح چوکس کھڑے ہیں"

"بہت اچھا" انسپکٹر جمشید دروازے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی، دروازہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا، وہ باہر سے بند تھا — انسپکٹر جمشید کچھ سوچتے ہوئے واپس چلے آئے۔

"کیا بات ہے، تم گئے نہیں"

"دروازہ باہر سے بند ہے" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب؟"

"معلوم ہوتا ہے فرزانہ عقل مندی دکھا گئی۔ وہ باہر جاتے ہوئے دروازہ بند کر گئی" انسپکٹر جمشید نے بتایا۔

"کیوں، اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"بس اس کا ذہن بھی عجیب ہے۔ شاید اس نے سوچا ہوگا کہ ہو سکتا ہے مجرم کمرے سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اپنی طرف سے وہ ان کا مکان سے باہر نکلنے کا راستہ بند کر گئی ہے"

"بہت خوب، بھئی تمہارے بچے بھی کمال کے ذہین ہیں" آئی

جی اور ڈی آئی جی ہنس پڑے۔

اچانک کمرے کے اندر محمود کے چلانے کی آواز آئی۔ وہ کہہ رہا تھا:

"خبردار، الماری کے اس خانے کو ہاتھ نہ لگانا"

○

"کیوں، اس خانے میں ایٹم بم رکھا ہے کیا" شوکت نے مذاق اڑایا۔

"نہیں، اس میں سیاہ سانپ رہتا ہے" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"بکواس"

"اچھا" محمود نے سعادت مندی سے کہا۔ شوکت الماری کے خانے کی چیزیں اٹھا اٹھا کر نیچے پھینک رہا تھا۔ اچانک گتے کا ڈبا اس کے ہاتھ لگا۔

"اسے نہ کھولنا" محمود نے اسے مشورہ دیا۔

"کیوں، اس میں شیشے کا بکس ہے کیا؟"

"نہیں، اس میں پھنیر سانپ ہے"

"پھر وہی بکواس"

"اچھا تمہاری مرضی۔" محمود نے اس طرح مایوسانہ انداز میں کہا جیسے شوکت کی موت قریب آگئی ہو۔

شوکت نے ڈبا کھول ڈالا، لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور ڈبا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جسے محمود نے دبوچ لیا۔ ڈبے میں ایک سانپ پھن پھیلائے جھوم رہا تھا۔

محمود اور فاروق بُری طرح ہنس رہے تھے۔ بیگم جمشید بھی مسکرا دیں۔

"دیکھا، میں نے کہا تھا نا، اس میں سانپ ہے۔"

"لعنت ہو تم پر۔ نقلی سانپ سے ڈرا دیا۔" شوکت جھینپ اٹھا۔

ایک بار پھر وہ الماری کی چیزیں الٹنے پلٹنے لگا۔ اس کا ساتھی بھی اس کی مدد کر رہا تھا۔

"اس گتے کے ڈبے کے اندر تو دیکھ لو۔ کہیں شیشے کا بکس اس میں نہ ہو۔" فاروق نے ان کا مذاق اڑایا۔

"بکو مت۔"

"تمہاری مرضی، پھر نہ کہنا، شیشے کے بکس کا پتا نہیں بتایا۔" محمود بولا۔

"تم خاموش نہیں رہو گے۔"

"کیوں، کیا میری آواز تمہیں زہر لگتی ہے۔" محمود نے پوچھا۔

"ہاں۔" شوکت چلایا۔

"فاروق۔" محمود نے فاروق کی طرف دیکھ کر کہا۔

"جی بھائی جان۔"

"انہیں میری آواز زہر لگتی ہے۔ اب تم باتیں کرو۔"

"جی اچھا۔ ہاں تو، میں کہنا چاہتا ہوں کہ اس کمرے میں .....۔" وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"ہاں، اس کمرے میں کیا؟"

"شیشے کا بکس اس کمرے میں ....۔" فاروق نے پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"تم بات مکمل کیوں نہیں کرتے۔" شوکت جھلا اٹھا۔

"ڈرتا ہوں، کہیں تمہیں میری آواز بھی زہر نہ لگ رہی ہو۔"

"نہیں، زہر نہیں لگ رہی ہے، تم بتاؤ۔"

"دیکھا بھائی جان۔ انہیں میری آواز پسند ہے۔"

"بھئی واہ، مان گیا میں تمہیں۔"

"ہاں، تم کیا کہہ رہے تھے۔" تنگ آکر شوکت نے نرم آواز میں پوچھا۔

"یہی کہ شیشے کا بکس اس کمرے میں نہیں ہے۔"

"خاموش۔" شوکت چیخا، غصے کے مارے اس کا بُرا حال

تھا: "میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔" وہ وحشیوں کی مانند محمود اور فاروق کی طرف جھپٹا۔

○

"چلو، تم دونوں کرسیوں پر بیٹھ جاؤ۔" فرزانہ اور بیگم شیرازی کو حکم دیا گیا۔

دونوں خوف زدہ تھیں۔ فوراً ہی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ اب ان دونوں نے اپنی جیبوں سے پتلی رسی نکالی اور انہیں کرسیوں کے ساتھ جکڑنا شروع کر دیا۔ جلد ہی وہ اس کام سے فارغ ہو گئے۔

"گھر میں اس وقت اور کون ہے؟" ایک نے پوچھا۔

"اور کوئی بھی نہیں ہے۔"

"کیوں، تمہارا شوہر کہاں ہے؟"

"وہ باہر گئے ہوئے ہیں۔"

"کیا تم دونوں ہی رہتے ہو؟"

"ہاں۔"

"اچھا، ہم پورے مکان میں گھوم پھر کر دیکھ لیتے ہیں کہ کوئی اور تو موجود نہیں۔"

"دیکھ لو۔"

دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔ فرزانہ ان کے جاتے ہی بولی:

"آپ نے جھوٹ کیوں بولا، آپ کا ملازم غفور کیا گھر میں نہیں ہے؟"

"گھر ہی میں ہے۔"

"پھر آپ کا کیا خیال ہے، یہ اسے ڈھونڈ نہیں سکیں گے؟"

"ہاں، یہ اس تک نہیں پہنچ سکیں گے۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ وہ سرونٹ کوارٹر میں سو رہا ہے اور سرونٹ کوارٹر تو تم جانتی ہی ہو، مکان کے پچھلی سمت میں ہے۔ یہ وہاں تک کہاں پہنچیں گے۔"

جلد ہی وہ دونوں واپس کمرے میں آ گئے۔

"ٹھیک ہے۔ مکان میں اور کوئی نہیں ہے۔ اچھا صبح تک اسی کمرے میں بند رہو۔"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" بیگم شیرازی نے ان کے جانے کے بعد پوچھا۔

"کسی نہ کسی طرح فون کرنا ہے۔"

"لیکن ہم دونوں تو بری طرح جکڑی ہوئی ہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں اگر زمین پر خود کو گرا لوں تو گھٹنوں اور ہتھیلیوں کے بل کھسک سکتی ہوں۔"

"لیکن تم فون کا نمبر کیسے ڈائل کرو گی؟"

"اس کی صرف ایک ہی صورت ہے۔"

"وہ کیا؟"

"یہ کہ میں کھسکتی ہوئی غفور کے کوارٹر تک جاؤں اور اسے جگا دوں۔ اس طرح ہم آزاد ہو سکتے ہیں۔"

"کوشش کر دیکھو۔"

فرزانہ نے پیروں پر دباؤ ڈالا، ہاتھوں کو آگے کی طرف کیا اور خود کو زمین پر گرا دیا۔ اس کے گھٹنوں پر شدید چوٹ لگی۔ اب اس کے گھٹنے اور ہتھیلیاں زمین پر ٹکی ہوئی تھیں اور کرسی اس کی کمر پر سوار تھی۔ وہ کھسکنے لگی۔ یہاں تک کہ دروازے تک پہنچ گئی۔

"کیوں، کیا خیال ہے۔" فرزانہ نے بیگم شیرازی سے پوچھا۔

"بہت خوب، تم نے تو کمال ہی کر دیا۔"

"خدا کا شکر ہے کہ وہ لوگ دروازہ بند نہیں کر گئے، ورنہ میرا کمال دھرا کا دھرا رہ جاتا۔"

"کیا میں بھی اسی طرح خود کو زمین پر گرا دوں اور تمہارے ساتھ چلوں؟" بیگم شیرازی نے پوچھا۔

"نہیں، آپ تکلیف نہ کریں۔ آپ کے لیے ایسا کرنا بہت مشکل ہو گا۔ میں کوارٹر کا راستہ جانتی ہوں اور امید ہے وہاں

تک پہنچ جاؤں گی۔"

"اچھا، اللہ تمہاری مدد کرے۔" بیگم شیرازی کے منہ سے نکلا۔

فرزانہ کمرے سے نکل چکی تھی۔

○

دونوں باہر نکل کر سیدھے کار کی طرف آئے۔

"کیوں، کیا رہا؟" سردار نے پوچھا۔

"ہم انہیں کرسیوں سے جکڑ آئے ہیں۔"

"وہ فون کرنے میں کامیاب تو نہیں ہوئی؟"

"جی نہیں۔"

"بہت خوب، اب ہمیں اندر کے معاملات میں دخل دینا ہو گا۔ ہمیں کمرے سے باہر جو لوگ موجود ہیں، ان پر قابو پانا ہو گا۔ تبھی ہم اپنے ساتھیوں کو شیشے کے ٹکڑے سمیت چھڑا سکیں گے۔"

"جی ہاں، آپ کا خیال ٹھیک ہے۔" ایک بولا۔

"تو مکان کے پچھلی طرف جو تمہارے دو ساتھی ہیں، انہیں بھی بلا لو۔"

"جی اچھا!" ان کا ساتھی یہ کہہ کر چلا گیا۔ جلد ہی وہ ان دونوں کو لے آیا۔

"اب تم چاروں اپنے پستول نکال کر مکان میں داخل ہو جاؤ اور کمرے کے باہر جتنے بھی آدمی موجود ہیں، ان پر قابو پانے کی کوشش کرو۔ دیکھو، پوری ہوشیاری سے کام کرنا ہے۔ میں باہر نہیں ٹھہروں گا، بلکہ تمہارے پیچھے تمہاری مدد کے لیے موجود رہوں گا۔"

"جی بہت اچھا۔"

چاروں نے اپنے پستول نکال لیے اور دروازہ باہر سے کھولتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ اس سے پہلے ان کا جو ساتھی اندر کے حالات کا جائزہ لے کر آیا تھا، وہی ان سب کو راستہ دکھا رہا تھا۔ چاروں اب اس جگہ پہنچ چکے تھے، جہاں سے بند دروازہ نظر آ رہا تھا۔ دروازے کے سامنے اس وقت بھی انسپکٹر جمشید اپنے دونوں ساتھیوں کے ساتھ موجود تھے۔

"ان کے تین ساتھی کمرے کے دائیں طرف والی کھڑکی کے پاس موجود ہیں اور تین بائیں طرف۔ تین یہ سامنے ہیں۔" اگلے نے سرگوشی کی۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں نو آدمیوں سے نبٹنا ہے۔" ایک بولا۔

"ہاں۔"

"ان کے ہاتھوں میں پستول تو نظر نہیں آ رہے ہیں۔"

"انسپکٹر جمشید کے ہاتھ میں پستول ہے، اسی طرح دائیں طرف والی کھڑکی پر بھی تین میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول ہے۔ بائیں طرف تو ہم دیکھ ہی نہیں سکتے۔"

"تو یوں کرتے ہیں کہ دو دو آدمی بیک وقت دونوں طرف جاتے ہیں، تیسری طرف بعد میں دیکھ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" چاروں دو دو کی ٹولیوں میں زمین پر گر کر سینے کے بل رینگنے لگے۔ پہلے اگلے دو انسپکٹر جمشید کے پاس پہنچے اور اٹھ کر پستول ان کی کمر سے لگاتے ہوئے ایک مدھم آواز میں بولا:

"خبردار، اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کرنا۔"

دوسرے ہی لمحے انسپکٹر جمشید اچانک نیچے بیٹھ گئے۔ حملہ آور اس اچانک حرکت سے بوکھلا گئے۔ انسپکٹر جمشید نے ان کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھایا اور ایک کی ٹانگ پر اس زور سے ٹھوکر ماری کہ وہ دوسری طرف الٹ گیا۔ اس کے ساتھ ہی ان کا مکا۔ دوسرے کی ٹھوڑی پر لگا۔ پستول ان کے ہاتھوں سے چھوٹ گئے۔ ڈپٹی آئی جی صاحب تیزی سے جھکے اور ان کے پستولوں پر قبضہ کر لیا۔

"آپ ان کو سنبھالیں، میں دائیں طرف دیکھتا ہوں۔"

انسپکٹر جمشید نے کہا اور پستول ہاتھ میں لیے دیوار کے ساتھ ساتھ دائیں طرف بڑھے۔ انہوں نے موڑ پر پہنچ کر دیکھا کہ ان کے تینوں ساتھی ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے ہیں ۔۔۔ دو آدمی ان پر پستول تانے ہوئے تھے۔ فائر کرنا خطرناک تھا، اس لیے وہ دبے پاؤں آگے بڑھے اور ایک کی کمر سے پستول کی نالی اور دوسرے کی کمر سے اپنی انگلی لگاتے ہوئے کہا:

"اپنے پستول زمین پر گرا دو، ورنہ چھلنی کر دوں گا۔"

دونوں نے گھبرا کر پستول نیچے گرا دیے۔ ان کے ایک ساتھی نے فوراً ہی جھک کر پستول اٹھا لیے۔

"کیا یہ اس کھڑکی کے ذریعے باہر آئے تھے؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"جی نہیں، یہ اندر سے نہیں ۔۔۔ بلکہ مکان کے باہر سے آئے تھے۔"

"اوہ، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجرموں کے ساتھی مکان کے باہر بھی موجود رہے ہیں۔" انہیں فرزانہ کے خیال نے پریشان کر دیا تھا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے کہا:

"اچھا، اب انہیں لے کر دروازے پر چلو۔" اب وہ سب چاروں مجرموں سمیت بند دروازے کے سامنے موجود تھے۔

"سب سے پہلے ان کو باندھنا چاہیے، تاکہ ان کی طرف سے

کوئی خطرہ نہ رہے۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔"

ان سب کے ہاتھوں میں پستول تھے اور چاروں مجرم ہاتھ اوپر اٹھائے کھڑے تھے۔ انسپکٹر جمشید گئے اور رسیاں لے آئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کے ہاتھ اور پاؤں جکڑ دیے گئے۔

"کیا تمہارا کوئی اور ساتھی بھی مکان کے باہر ہے؟"

"نہیں۔" ایک بولا۔

"تمہیں یہاں کس نے بھیجا ہے؟"

"ہمارے سردار نے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"سردار۔"

"بہت خوب، تو تم نام نہیں جانتے۔"

"ہاں، ہم نہیں جانتے۔"

"کوئی بات نہیں ۔۔۔ کیا تم سب شیشے کا ٹکڑا حاصل کرنے آئے تھے؟"

"ہمیں نہیں معلوم۔"

ان کے جکڑے جانے کے بعد انسپکٹر جمشید اور ان کے ساتھیوں نے اپنے اپنے پستول اپنی جیبوں میں رکھ لیے اور یہی ان کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ مجرموں

کا سردار اسی انتظار میں ہے کہ کب وہ لوگ پستول اپنی جیبوں
میں رکھیں اور کب وہ موقعے سے فائدہ اٹھائے۔

سردار ایک تاریک گوشے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جوں ہی
ان کے پستول جیبوں میں گئے، وہ اپنی جگہ سے نکلا اور ان کی
طرف بڑھنے لگا۔ سٹین گن اس کے ہاتھ میں تھی۔

فرزانہ میدانِ عمل میں

فرزانہ ایک ایک انچ آگے بڑھ رہی تھی۔ اس حالت میں
کھسکنا سخت دشوار تھا، لیکن مسئلہ تھا پوری قوم کا مسئلہ۔ ملک
کا مسئلہ۔ اسے ہر حال میں غفور تک پہنچنا تھا۔ اس کی ہتھیلیاں
اور گھٹنے چھل رہے تھے، کمر میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ مگر برابر
آگے بڑھ رہی تھی۔ پسینے سے اس کا سارا جسم بھیگ چکا
تھا۔ آخر کار وہ غفور کے کوارٹر تک پہنچ گئی۔ وہ کوارٹر کے
دروازے کے پاس برآمدے کے نیچے سو رہا تھا۔ فرزانہ نے
اپنے ہاتھ چارپائی کی پٹی تک لے جانے کی کوشش کی، لیکن
ممکن نہ ہوا۔ پھر اس نے چارپائی کے پائے کو پکڑ کر ہلایا،
لیکن اس قدر معمولی جنبش سے غفور بھلا کہاں جاگنے والا تھا۔
وہ تو شاید گھوڑے بیچ کر سویا ہوا تھا۔ آخر کار فرزانہ نے اپنا رخ
تبدیل کیا۔ اب کرسی چارپائی کی طرف تھی اور فرزانہ دوسری طرف۔
اس نے کرسی کو چارپائی سے دے مارا۔ غفور ہڑبڑا کر اٹھا۔

"کک، کون..... کیا ہے.....؟" وہ گھبرا گیا — ہلکی ہلکی روشنی میں اسے فرزانہ نظر نہیں آئی تھی۔

"یہ میں ہوں، غفور چچا۔"

"مم، میں کون ؟"

"فرزانہ۔"

"کہاں ہو تم ؟"

"یہ رہی تمہاری چارپائی کے پاس۔" اب غفور نے نیچے دیکھا اور بوکھلا اٹھا—

"ارے باپ رے، کرسی مجھ سے باتیں کر رہی ہے۔ یا اللہ خیر— جل تو جلال تو— ارے مر گیا۔"

"غفور چچا، یہ میں ہوں فرزانہ۔" فرزانہ کو اس حالت میں بھی ہنسی آ گئی۔

"باپ رے باپ، اب کرسیاں بھی بولنے لگیں۔" وہ تھر تھر کانپنے لگا—

تنگ آ کر فرزانہ نے اپنا رخ تبدیل کیا اور غفور کے سامنے ہو گئی۔ غفور نے اسے دیکھا تو اور بھی حیران ہوا۔

"ہائیں، تم کرسی کے نیچے کیا کر رہی ہو ؟"

"میں کرسی سے بندھی ہوئی ہوں۔ مجھے فوراً کھول دو۔"

"تو خود کو کرسی سے باندھنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔"

"مجھے فوراً کھول دو چچا، ہم سب خطرے میں ہیں۔"

"کیا، خطرے میں ہو۔"

"ہاں، جلدی کرو۔"

غفور نے رسی کھولنے کی کوشش کی، لیکن پورا زور صرف کرنے پر بھی رسی کی گرہ نہ کھلی۔

"کیا بات ہے— کھولتے کیوں نہیں۔"

"ٹھہرو، کسی چاقو کی مدد سے کھلے گی یہ، میں ابھی لاتا ہوں۔" غفور کوارٹر میں گھس گیا اور جلد ہی چاقو لیے برآمد ہوا۔ اس مرتبہ رسی کھلنے میں دیر نہ لگی۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ۔"

"لیکن بات کیا ہے ؟"

"بات بعد میں بتاؤں گی— پہلے چل کر بیگم صاحبہ کی رسیاں بھی کاٹ ڈالو۔"

"کیا مطلب، کیا بیگم صاحبہ بھی بندھی ہوئی ہیں ؟"

"ہاں، ڈرائنگ روم میں ہیں۔"

دونوں تقریباً دوڑتے ہوئے ڈرائنگ روم میں آئے— غفور تو بیگم شیرازی کی رسیاں کاٹنے لگا اور فرزانہ فون کی طرف لپکی—

اس مرتبہ نمبر فوراً ہی مل گیا—

"ہیلو، کون صاحب ؟"

"میں فرزانہ بول رہی ہوں۔"

"فرزانہ، کون فرزانہ؟" دوسری طرف سے پوچھا۔

"انسپکٹر جمشید کی لڑکی۔"

"اوہ، فرمائیے، کیا بات ہے۔"

"ہم سب خطرے میں ہیں۔ آئی جی اور ڈی آئی جی صاحبان بھی یہیں ہیں۔ فوراً پولیس کی پوری لاری لے کر آئیں اور مکان کو چاروں طرف سے گھیر لیں۔"

"کیا مطلب، مکان کو گھیر لیں۔"

"ہاں، میرے ابو کی یہی ہدایت ہے۔"

"بہت اچھا، ہم آرہے ہیں۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔ فرزانہ نے فون کا ریسیور رکھ کر سکون کا سانس لیا۔

○

"تم سب اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو، ورنہ بھون کر رکھ دوں گا۔ میرے ہاتھ میں سٹین گن ہے، کوئی بچوں کا کھلونا نہیں۔" سردار نے سامنے آتے ہی کہا۔ اسے دیکھ کر وہ سب چونک اٹھے، پھر ان کے ہاتھ خود بخود اوپر اٹھ گئے۔

"بہت خوب، اب ان چاروں کی رسیاں کھول دو، تاکہ تمہارے

ہاتھ پاؤں باندھ سکیں۔" نقاب پوش نے چہکتی آواز میں کہا، لیکن ان میں سے کسی نے اپنی جگہ سے حرکت نہ کی۔

"کیا تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے — ان کی رسیاں کھول دو۔"

"ہم نے ایسے کام کبھی نہیں کیے دوست۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"لیکن آج تمہیں یہ کام کرنا ہی ہو گا۔" سردار بھی مسکرایا۔

"کوشش کر دیکھو۔"

"تو تم ان کی رسیاں نہیں کھولو گے؟"

"نہیں۔"

"بہت اچھا — میں تم سے سمجھ لوں گا۔ معلوم ہوتا ہے، تم لوگ اپنی زندگی سے تنگ آچکے ہو۔" نقاب پوش نے پرسکون آواز میں کہا۔

"ہاں، ہمارے نزدیک اس زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہے، جتنی قوم اور ملک کی ہے اور تم اس قوم اور ملک کی بقا کا سودا کر رہے ہو۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"بہت خوب — تو تمہیں یہ بھی معلوم ہے۔"

"ہمیں کیا معلوم نہیں۔"

"اچھا خیر، میں اپنا وقت ضائع نہیں کروں گا۔ تم رسیاں نہیں کھولتے، نہ سہی۔" نقاب پوش نے کہا اور بند دروازے کی

طرف بڑھا۔ وہ الٹے قدموں چل رہا تھا اور اس حالت میں بھی
اس کی سٹین گن کا رخ ان کی طرف رہا۔
"شوکت، تنویر، دروازہ کھول دو۔"
"دروازہ کھول دیں، کیا مطلب؟" شوکت جو محمود اور فاروق
کی طرف جھپٹا تھا، درمیان میں ہی رُک گیا۔
"میں تمہارا سردار ہوں ۔۔ حالات اس وقت میرے کنٹرول
میں ہیں۔ تم بے فکر ہو کر دروازہ کھول دو۔"
"وہ مارا ۔۔" شوکت چلایا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل
گیا۔
"تم تینوں ان کی رسیاں کھول دو اور آپ حضرات کمرے میں
چلیں۔" اس نے اپنے ساتھیوں اور انسپکٹر جمشید وغیرہ کو حکم دیا۔
انسپکٹر جمشید جوں ہی کمرے میں داخل ہوئے، محمود اور فاروق
'ابا جان' کہتے ہوئے ان سے لپٹ گئے ۔۔ ان کی آنکھوں میں آنسو
تیر رہے تھے۔
"حوصلہ رکھو بیٹا، حوصلہ رکھو۔" انسپکٹر جمشید نے انہیں تسلی دی۔
"شیشے کا بکس کہاں ہے۔" سردار نے شوکت سے پوچھا۔
"جی، وہ، وہ ہمیں اس کمرے میں کہیں نہیں ملا۔" شوکت نے
بوکھلا کر کہا۔
"گدھے ہو تم ۔۔ اتنی دیر تک بند کمرے میں دو بچوں اور ایک

عورت سے یہ معلوم نہیں کر سکے کہ بکس کہاں ہے۔"
"ہم اس پورے کمرے میں دیکھ چکے ہیں جناب، وہ یہاں
نہیں ہے۔"
"خاموش رہو اور اپنے چاروں ساتھیوں کو فوراً کھول ڈالو۔"
شوکت، تنویر اور جاوید رسیاں کھولنے لگے۔ جلد ہی چاروں
کھڑے انسپکٹر جمشید کو بُری طرح گھور رہے تھے۔
"چلو اب تم ساتوں اس پورے کمرے کی اچھی طرح تلاشی
لو۔" نقاب پوش نے حکم دیا اور وہ فوراً تلاشی لینے میں جٹ گئے
"انسپکٹر جمشید، بہتر ہو گا کہ تمہارے لڑکے بکس کا پتا بتا
دیں ۔۔ میں زیادہ دیر انتظار نہیں کر سکتا۔"
"آپ کتنی دیر انتظار کر سکتے ہیں۔" فاروق نے معصومیت
سے کہا۔
"چپ چاپ کھڑے رہو ۔۔ بے وقوف لڑکے ۔۔ تم اس وقت
موت کے دروازے پر کھڑے ہو۔"
"اچھا، مجھے نہیں معلوم تھا۔"
"خاموش رہو۔" نقاب پوش غرایا۔
"جی بہت بہتر۔" فاروق نے سعادت مندی سے کہا اور ہونٹ
مضبوطی سے بند کر لیے۔ اس کے اس انداز پر کئی چہروں پر
مسکراہٹ دوڑ گئی۔

انہوں نے پورا کمرہ چھان مارا، لیکن شیشے کا بکس انہیں کہیں نہ ملا۔

"میں دس تک گنوں گا — ٹھیک دس پر بھی اگر تم نے نہ بتایا کہ بکس کہاں ہے تو دھڑا دھڑ گولیاں برسانا شروع کر دوں گا اور تم سب یہاں تڑپتے نظر آؤ گے۔"

"میں خود حیران ہوں۔" محمود نے اس کے خاموش ہوتے ہی کہا۔

"کیا مطلب؟"

"میں حیران ہوں کہ شیشے کا بکس کہاں چلا گیا۔ میں نے اس الماری کے اوپر والے خانے میں رکھا تھا۔"

"تم جھوٹ بکتے ہو۔"

"فاروق سے پوچھ لو۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہے ہیں — شیشے کا ٹکڑا انہوں نے میرے سامنے اس الماری میں اوپر والے خانے میں رکھا تھا۔"

"تو پھر وہ کہاں جا سکتا ہے؟"

"ہمیں نہیں معلوم — ہو سکتا ہے کہ تمہاری طرح کوئی اور پارٹی بھی اسے حاصل کرنے کی فکر میں ہو — اور وہ تم سے پہلے اسے اڑا لے گئی ہو۔"

مجھے چکر دینے کی کوشش نہ کرو۔ اس شیشے کے بکس کے

بارے میں میرے علاوہ صرف تمہارے آئی جی کو معلوم تھا۔ یا پھر اس سائنس دان کو جو اب موت کی میٹھی نیند سو رہا ہے۔"

"تو پروفیسر راشدی کے قاتل تم ہو؟" انسپکٹر جمشید نے پوچھا۔

"اس نے وہ فارمولا میرے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا، لیکن افسوس اسے قتل کرنے کے بعد فارمولا مجھے وہاں کہیں نہ ملا، پھر مجھے شیشے کے اس ٹکڑے کے بارے میں معلوم ہوا۔ یہ معلومات پروفیسر کے اسسٹنٹ سے حاصل ہوئیں، میں سمجھ گیا کہ فارمولا ضرور اس میں ہے۔"

"پھر اب کیا ارادہ ہے — بکس تو یہاں نہیں ہے۔"

"وہ یہیں ہے، تمہارے بیٹے اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں گنتی شروع کرتا ہوں — اگر انہیں تم سب کی زندگی عزیز ہے تو بتا دیں گے، ورنہ نہیں — ہاں تو، ہوشیار — اب بھی وقت ہے کہ بتا دو — گولیاں سب سے پہلے تمہاری والدہ کا سینہ چھلنی کریں گی — ایک — دو — تین — چار —" وہ ایک لمحے کے لیے رکا — پھر گننے لگا۔

"پانچ — چھ — سات —"

سب کے دل بری طرح دھک دھک کر رہے تھے۔ اچانک کمرے میں محمود کا زبردست قہقہہ گونجا:

"ہا ہا ہا ہا —" یوں لگتا تھا، جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔ انسپکٹر

جمشید بھی گھبرا کر اسے دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے، تم ہنس کیوں رہے ہو؟" نقاب پوش نے پوچھا۔

"میں ہنس اس لیے رہا ہوں کہ رو نہیں سکتا۔"

"کیا مطلب؟"

"بات یہ ہے کہ سب سے پہلے تم میری والدہ کو نشانہ بناؤ گے، اور صرف انھی کو معلوم ہے کہ شیشے کا بکس کہاں ہے؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بکس میں نے ان کے حوالے کر دیا تھا۔"

"بہت خوب، یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ اب میں سب سے پہلے تمہیں نشانہ بناؤں گا۔ کوئی ماں اپنے بیٹوں کو گولی کھاتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"تم غلط کہتے ہو۔۔ اس قوم نے ایسی بہت سی ماؤں کو جنم دیا ہے۔"

"ابھی معلوم ہوا جاتا ہے ۔۔۔ سات ۔۔۔ آٹھ ۔۔۔ نو۔" اس نے سٹین گن کا رخ محمود کی طرف کر دیا تھا۔ اچانک انسپکٹر جمشید چلائے۔

"ٹھہرو۔" نقاب پوش دس کہتے کہتے رک گیا۔

○

فون کرنے کے بعد فرزانہ بیرونی دروازے پر آئی۔ اس نے آواز پیدا کیے بغیر چٹخنی گرا دی اور دروازہ تھوڑا سا کھولا، باہر جھانکا باہر اسے وہ دونوں کہیں بھی دکھائی نہ دیئے، پھر اس نے مجرموں کی کار کی طرف دیکھا۔ اسے کار میں بھی کوئی بیٹھا نظر نہیں آیا۔

وہ باہر نکل کر تیزی سے اپنے گھر کی طرف بڑھی۔ دبے پاؤں اندر داخل ہوئی۔ راستے میں اسے کوئی نہ ملا ۔۔ اس کی حیرت اور پریشانی بڑھتی جا رہی تھی۔ یہاں تک کہ وہ اس کمرے کے دروازے کے پاس پہنچ گئی، جس میں محمود اور فاروق بند تھے۔ اس کمرے کا دروازہ کھلا دیکھ کر وہ چونکی اور دروازے کی طرف جانے کی بجائے کھڑکی کی طرف بڑھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ کھڑکی کی ایک جھری سے آنکھ لگا چکی تھی۔

اندر کا منظر اس کے ہوش اڑا دینے کے لیے کافی تھا۔۔ کوئی شخص نقاب میں چہرہ چھپائے سٹین گن محمود کی طرف تانے ہوئے تھا۔ ایک طرف اسے اپنی والدہ بھی نظر آئیں۔۔ دوسرے کونے میں اس کے والد اور دوسرے لوگ ہاتھ اٹھائے کھڑے تھے۔

وہ سوچ میں ڈوب گئی، اب کیا کیا جائے۔ میں کیا کر سکتی ہوں،

ان سب کے لیے — ملک اور قوم کے لیے — پولیس والے بھی ابھی تک نہیں پہنچے۔ اس وقت تک ان کو آ جانا چاہیے تھا۔ میں تنہا کیا کر سکتی ہوں — اس کا ذہن سوچ کی وادیوں میں بھٹکتا رہا — اچانک اس کی آنکھوں میں امید کی کرن لہرائی — وہ دبے پاؤں واپس پلٹی اور اپنے والد کے کمرے میں آئی۔ اس نے ان کی الماری کھولی — ادھر ادھر کوئی چیز تلاش کی۔ جلد ہی اسے وہ چیز مل گئی — اس نے اسے مٹھی میں دبایا اور باہر نکل آئی — ایک بار پھر وہ اسی کمرے کی طرف جا رہی تھی۔

بکس کہاں تھا؟

"کیا ہوا انسپکٹر، بیٹے کی موت سامنے دیکھ کر گھبرا گئے" نقاب پوش ہنسا۔

"نہیں، یہ بات نہیں ہے — بیگم، کیا واقعی تمہیں معلوم ہے کہ شیشے کا بکس کہاں ہے؟"

"ہاں"

"تب پھر ٹھیک ہے۔ تم ان لوگوں کو بتانا تو نہیں چاہتیں"

"نہیں"

"بہت خوب، مسٹر نقاب پوش تم نو تک گن چکے ہو — دس کہہ کر گولی چلاؤ" انسپکٹر جمشید نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"ٹھہرو بھئی" اس مرتبہ آئی جی بولے: "میرے ہوتے ہوئے یہ ظلم نہیں ہو سکتا — اگر شیشے کا ٹکڑا انہیں مل بھی جائے تو کئی مرحلے باقی رہ جاتے ہیں۔ آپ یوں کریں کہ انہیں بتا دیں وہ کہاں ہے"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ شیشے کا بکس کھولنا اتنا آسان نہیں۔ اسے حاصل کرنے کے بعد بھی یہ اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکیں گے، لیکن دوست! یہ تو بتاؤ، تم آخر اس فارمولے کا کرو گے کیا؟" آئی جی صاحب نے پوچھا۔

"بیچوں گا دشمن ملک کے ہاتھوں۔" نقاب پوش بولا۔

"کیا سودا طے ہو چکا ہے؟"

"ہاں — دو کروڑ روپے میں سودا طے ہوا ہے۔"

"کیا دشمن ملک کے ایجنٹ تم سے مل چکے ہیں؟"

"ہاں، آج رات بارہ بجے مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے ان کے تین آدمی موجود ملیں گے — دو کروڑ روپے ان کے پاس ہوں گے"

"اور پھر وہ اسے حاصل کر کے اپنے سائنس دانوں کے حوالے کر دیں گے۔ سائنس دان اس فارمولے کی مدد سے وہ حیرت انگیز بم بنائیں گے — پھر، پھر کیا ہوگا، وہ بم تمہارے اپنے ملک پر پھٹیں گے، کیا تمہارا خیال ہے تم زندہ بچ جاؤ گے۔ دو کروڑ کا لطف اٹھانے کے لیے۔" آئی جی صاحب شاید اسے باتوں میں لگا کر وقت گزارنا چاہتے تھے۔

"ہاں، میں زندہ رہوں گا۔" نقاب پوش ہنسا۔

"وہ کیسے؟" انہوں نے پوچھا۔

"اس طرح کہ ان کے ساتھ میں بھی ان کے ملک میں چلے جانے کا پروگرام بنا چکا ہوں۔"

"بھئی واہ، بہت اچھا پروگرام ہے — اب میں بھی تم سے ایک سودا کرنا چاہتا ہوں۔" آئی جی کے جملے نے سب کو چونکا دیا۔

"سودا، کیا مطلب؟"

"میں تمہیں اڑھائی کروڑ دلوا سکتا ہوں — کیا تم اڑھائی کروڑ حاصل کرنا پسند کرو گے؟"

"میں اتنا بے وقوف نہیں، آپ مجھے کب زندہ چھوڑیں گے؟"

"تو کیا تمہیں یقین ہے — دشمن ملک کے ایجنٹ شیشے کا بکس حاصل کرنے کے بعد تمہیں زندہ چھوڑ دیں گے؟"

"ہاں، مجھے یقین ہے۔"

"یہی تمہاری بھول ہے — اپنے ملک کی سرحد پار کرتے ہی وہ سب سے پہلے تمہیں گولی مار دیں گے۔ تم اپنی قوم کے ساتھ غداری کر سکتے ہو تو ان کے ساتھ بھی کر سکتے ہو۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا — میں اس ملک کا نہیں، بلکہ انہی ملک کا ایک فرد ہوں — میری حکومت نے آج سے پچیس سال پہلے مجھے مہاجر کے روپ میں یہاں بھیجا تھا تاکہ اپنے ملک کے لیے جاسوسی کرتا رہوں۔ آج یہ میرا آخری کام تھا — تم وقت گزاری کے لیے سوالات کر رہے ہو۔ تم سمجھتے ہوگے کہ جس لڑکی

کو تم لوگوں نے فون کرنے بھیجا تھا، اس نے فون کر دیا ہو گا۔"
"یہی تمہاری غلط فہمی ہے۔ میرے آدمی اس لڑکی کو کرسی کے ساتھ جکڑ آئے ہیں اور صرف اس لڑکی کو ہی نہیں، اس کوٹھی میں جو عورت موجود تھی، اس کا بھی یہی حشر ہوا ہے۔ اس لیے اگر تم لوگوں کا خیال یہ ہے کہ ابھی چند لمحوں بعد پولیس آ جائے گی تو تمہارا خیال بالکل غلط ہے ۔۔۔ اب کہو، کیا کہتے ہو۔ ہاں تو بیگم جمشید، تم مجھے اس شیشے کے بکس کا پتا بتا رہی ہو یا میں فائر کروں۔" وہ اتنا کہہ کر بیگم جمشید کو گھورنے لگا۔

اس کی بات سن کر ان سب کے دل ڈوب گئے ۔۔۔ تو فرزانہ بھی پھنس گئی۔ ان سب نے سوچا۔ اچانک بیگم جمشید کو تیزی سے ایک خیال آیا۔

"میں بتانے کے لیے تیار ہوں۔"

"تو بتاؤ، کہاں ہے وہ۔"

"امی جان، یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔" محمود چلایا؛ حالاں کہ اسے معلوم تھا کہ اس کی امی کچھ نہیں جانتیں۔

"بیگم، ہرگز نہ بتانا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"تو میں فائر کرتا ہوں۔" نقاب پوش نے سٹین گن محمود پر تان دی۔ اس کی انگلی ٹریگر پر دباؤ ڈالتی محسوس ہوئی۔

"وہ بکس فرزانہ کے پاس ہے۔" اچانک بیگم جمشید کے منہ سے نکلا۔

"کیا، فرزانہ کے پاس ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

"ہاں، جس وقت یہ لوگ اندر آئے تو وہ آپ کے ساتھ تھی اور شیشے کا بکس اس کی جیب میں تھا۔"

"کیا تم اس لڑکی کا ذکر کر رہے ہو، جسے فون کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔"

"ہاں۔"

"بہت خوب، شوکت تم فوراً ایک ساتھی کو لے کر ساتھ والے مکان میں جاؤ اور فرزانہ کو کھول کر اس کی تلاشی لو، شیشے کا بکس مل جائے تو اسے لے کر فوراً یہاں پہنچو، اور ہاں، اس لڑکی کو بھی ساتھ ہی لے آنا۔" نقاب پوش نے حکم دیا۔

"بہت اچھا جناب۔" شوکت نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

بیگم جمشید نے اپنی ذہانت سے چند منٹ اور حاصل کر لیے تھے، لیکن کب تک، یہ چند منٹ بھی فوراً ہی گزر گئے۔ شوکت اندر داخل ہوا۔

"کیا بات ہے، تم اکیلے آئے ہو۔"

"رسیاں کٹی پڑی ہیں اور وہ لڑکی اور عورت غائب ہے۔"

"وہ مارا۔" انسپکٹر جمشید کے منہ سے نکلا۔

"کیا بکتے ہو ۔۔۔ وہ رسیاں کیسے کاٹ سکتی تھیں۔"

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں سر۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں خود حیران ہوں۔"

"بس اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک طرف ہٹ جاؤ۔ میں ان سب کو ایک ہی وار میں بھون ڈالوں گا۔" نقاب پوش کی آواز خوف ناک ہو گئی۔

عین اسی وقت وہ سب چونک اٹھے۔ پولیس کی سیٹی پوری آواز سے بجی تھی۔ نقاب پوش بھی گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی توجہ ان لوگوں پر سے ہٹ گئی اور اسی لمحے کا انسپکٹر جمشید کو انتظار تھا۔ انہوں نے بجلی کی سی تیزی سے نقاب پوش پر چھلانگ لگا دی۔ اسے زبردست دھکا لگا ———— اور وہ زمین پر آ رہا۔ ساتھ ہی سٹین گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ نقاب پوش کا ایک ساتھی اپنی جگہ سے اچھلا اور سٹین گن کی طرف آیا۔ محمود پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے ایک زور دار ٹھوکر سٹین گن کے ماری۔ سٹین گن اس ساتھی کے پاس سے گزرتی ہوئی بیگم جمشید کے پاس آ کر رکی۔ ایک دوسرے ساتھی نے اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کے پیٹ میں ڈی آئی جی صاحب کی لات لگی اور وہ کراہ کر الٹ گیا۔ دوسرے ہی لمحے ڈی آئی جی صاحب سٹین گن اپنے قبضے میں لے چکے تھے۔ انسپکٹر جمشید اور

نقاب پوش ابھی تک ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے تھے۔

"تم سب لوگ اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دو۔ خبردار کوئی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرے۔" ڈی آئی جی نے گرج دار آواز میں کہا۔

انسپکٹر جمشید نے نقاب پوش کو چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ نقاب پوش اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ باہر سے اب تک پولیس کی سیٹی کی آواز آ رہی تھی۔

"او بے وقوفو، تم کمرے سے باہر کھڑے سیٹی بجا رہے ہو، اندر کیوں نہیں آتے۔" انسپکٹر جمشید نے چلا کر کہا۔ انہیں پولیس والوں پر غصہ آ رہا تھا، جو ان کے خیال کے مطابق کمرے سے باہر سیٹی بجا رہے تھے۔

دوسرے ہی لمحے فرزانہ سیٹی بجاتے ہوئے پریڈ کے انداز میں قدم اٹھاتے ہوئے کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

"ارے یہ کیا، کیا یہ سیٹی تم بجاتی رہی ہو؟"

"جی ابا جان۔"

"واہ بھئی وا۔ تم نے بہت شاندار کام کیا ہے۔" آئی جی صاحب بول اٹھے۔

"حیرت انگیز۔" ڈی آئی جی صاحب کے منہ سے نکلا۔

"آپ کے بچے درحقیقت بہت ہی ذہین ہیں۔" ایک اور افسر نے کہا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پولیس کو فون نہیں کر سکیں۔"

"میں فون کر چکی ہوں ابا جان۔ وہ لوگ آتے ہی ہوں گے۔"

اسی وقت بہت سے دوڑتے قدموں کی آواز سنائی دی۔

"لیجیے، شاید وہ آ گئے۔" فرزانہ بولی۔۔۔

پولیس والے دروازے پر نمودار ہوئے۔۔۔

"گرفتار کر لو، ان سب کو۔" آئی جی نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

چند لمحوں تک ہتھکڑیوں کی کھنکھناہٹ کمرے میں گونجتی رہی۔ آخر میں نقاب پوش کا نمبر آیا۔ اس کے ہاتھوں میں بھی ہتھکڑی لگا دی۔۔۔

"یہ کون ہے، اس کا نقاب نوچ لو۔" آئی جی صاحب نے جوش کی حالت میں کہا۔

"میں انہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا مطلب، تم جانتے ہو۔"

"ہاں، ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی انہیں پہچانا ہے۔"

"کون ہے یہ؟"

"ہمارے سابق ڈی آئی جی کے دوست خان جبار۔"

"کیا، خان جبار۔۔۔ نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو کافی عرصے سے ملک سے باہر ہیں۔" آئی جی بولے: "میں خود انہیں جانتا ہوں، وہ میرے بھی دوست ہیں۔۔۔"

"ایسے بڑے بڑے آفیسر ان کے دوست ہیں۔ اسی لیے تو یہ قیمتی معلومات حاصل کر لیتے ہیں۔ اس سے پہلے یہ سابق ڈی آئی جی صاحب سے اپنے مطلب کی باتیں معلوم کرتے رہے ہیں۔۔۔ ان کے ریٹائر ہونے کے بعد انہوں نے آپ سے دوستی گانٹھ لی ہوگی اور شاید ڈی آئی جی صاحب سے بھی ان کے دوستانہ تعلقات ہوں۔ کیوں سر، میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔"

"ہاں، تم بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔۔۔ خان جبار میرا بھی دوست ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ خان جبار نہیں ہے۔ وہ واقعی بہت دنوں سے ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔"

"خیر ابھی پتا چل جائے گا۔" انسپکٹر جمشید نے کہا: "لیکن میں حیران ہوں۔۔۔ جب آپ کے خیال میں یہ ملک سے باہر گیا ہوا تھا تو اسے شیشے کے ٹکڑے کے بارے میں کس سے معلوم ہوا، کیونکہ یہاں موجود ہوتے ہوتے تو یہ آپ سے کوئی بات معلوم کر سکتا تھا۔۔۔ ضرور اس فارمولے کے بارے میں اس نے کسی اور سے معلوم کیا ہوگا۔۔۔ کیوں مسٹر خان جبار۔ کیا تم بتا سکتے ہو، تمہیں اس فارمولے کے متعلق کس نے بتایا تھا؟"

"یہ خان جبار نہیں ہے انسپکٹر۔۔۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ خان جبار میرا دوست ہے اور میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔" آئی جی نے غصے سے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ انسپکٹر اکرام، اس کا نقاب اتار دو۔" انہوں
نے اپنے ماتحت سے کہا۔

سب انسپکٹر اکرام آگے بڑھا اور نقاب پوش کے چہرے سے
نقاب اتار لیا۔

"خان جبار۔" آئی جی اور ڈی آئی جی کے منہ سے حیرت
کی زیادتی سے نکلا۔

"جی، اب فرمائیے۔"

"تمہارا خیال ٹھیک نکلا۔ ہمیں حیرت ہے۔"

"اب اپنے دوست سے معلوم کریں کہ اسے اس فارمولے
کے بارے میں کس نے بتایا تھا؟"

"ہاں، خان جبار، اب بتا ہی دو، ورنہ ہم دوسرے طریقوں
سے بھی معلوم کر سکتے ہیں۔"

"میں نے پروفیسر کے اسسٹنٹ سے معلوم کیا تھا۔" خان
جبار نے کہا۔

"تو کیا پروفیسر کا اسسٹنٹ بھی غدار ہے؟"

"نہیں، میں نے اسے اغوا کر لیا تھا۔ وہ پروفیسر سے چند
دن کی چھٹی لے کر اپنے گھر جا رہا تھا کہ راستے میں اسے میں
نے اغوا کرا لیا۔ اس سے چھ ماہ پہلے پروفیسر کا ایک بیان کسی
اخبار میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس نے ایک بم کے فارمولے

کے بارے میں ذکر کیا تھا۔ ان دنوں فارمولے کا صرف خیال ہی پروفیسر
کے ذہن میں تھا۔ اسی لیے اس نے اخبار میں دینے میں کوئی
حرج نہ سمجھا، لیکن میں اسی دن سے اس کی ٹوہ میں رہنے لگا،
پھر اس کے اسسٹنٹ کو اغوا کیا اور اسے اذیتیں دے دے
کر آخر اس سے معلوم کر ہی لیا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پروفیسر
فارمولا مکمل کر چکا ہے اور اسے اس نے شیشے کے ایک چھوٹے سے
بکس میں رکھا ہے۔ میں ایک دن رات کے وقت پروفیسر کی تجربہ گاہ
میں داخل ہو گیا۔ شیشے کا بکس ہر جگہ تلاش کیا، لیکن کہیں نہ ملا۔
تجربہ گاہ کی چیزیں چونکہ الٹ پلٹ ہو گئی تھیں، اس لیے پروفیسر کو
شک ہو گیا۔ اس نے آئی جی کو فون کیا۔ انہوں نے اس کی حفاظت
کے لیے پولیس بھیج دی، لیکن اس پر بھی پروفیسر کا اطمینان نہیں
ہوا۔ اس نے اپنے ایک آدمی کے ہاتھ شیشے کا بکس آئی جی
صاحب کو بھیج دیا۔ کوٹھی کے باہر پولیس پہرہ دے رہی تھی اور
اس سے تھوڑے فاصلے پر میرے آدمی بھی نگرانی کر رہے تھے۔
انہوں نے اس آدمی کو نکلتے دیکھا تو اس کا پیچھا کیا، لیکن وہ یہ
نہیں جانتے تھے کہ شیشے کا بکس اس کے پاس ہے اور نہ ہی
میں نے انہیں شیشے کے بکس کے متعلق بتایا تھا۔ اس طرح شیشے کا
بکس آئی جی کے پاس پہنچ گیا۔ رات کو میں پھر تجربہ گاہ میں
داخل ہوا۔ اندر پروفیسر صاحب موجود تھے۔ وہ میرے ہاتھوں مارے

گئے۔ بعد میں مجھے اپنے آدمیوں سے معلوم ہوا کہ پروفیسر کا ایک آدمی آئی جی کے پاس گیا تھا۔

محکمہ سراغرسانی میں میرے دو آدمی پہلے ہی موجود تھے۔ رحیم اور چوکیدار کو میں نے ہی ملازم کرایا تھا۔ اس ملازمت سے پہلے سے ہی وہ میرے ملازم تھے۔۔ رحیم کے ذریعے مجھے معلوم ہوا کہ شیشے کا ٹکڑا انسپکٹر جمشید کے حوالے کیا گیا ہے۔ میں نے رحیم کو حکم دیا کہ شیشے کا ٹکڑا اڑا لائے۔ اس کے بدلے میں نے اسے دس ہزار روپے دینے کا بھی وعدہ کیا اور کہا کہ باہر کھڑے ہوئے میرے دو ساتھیوں کے حوالے کر دے۔ رحیم نے میز کی دراز سے ٹکڑا اڑا تو لیا، لیکن پھر وہ بے ایمانی پر اتر آیا۔ اس نے سوچا تھا کہ شیشے کا بکس ضرور کوئی قیمتی چیز ہے اور وہ اس کے بدلے شاید کوئی بڑی قیمت وصول کر سکے۔۔ اسی خیال سے اس نے شیشے کا بکس میرے دونوں ساتھیوں شوکت اور تنویر کے حوالے نہ کیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ شوکت اور تنویر نے اس کا تعاقب کیا۔۔ یہاں تک کہ رحیم نشنل پارک میں گھس گیا۔ پارک کے دروازے پر ہی دو لڑکے بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ رحیم نے اس خیال سے شیشے کا بکس ان کے پاس گرا دیا کہ بعد میں ان سے لے لے گا، لیکن آگے جا کر پکڑا گیا اور اس سے پہلے کہ میرے دونوں ساتھی ان دونوں لڑکوں سے بکس حاصل کرتے، وہ وہاں سے جا چکے تھے۔۔ بعد میں معلوم ہوا

کہ وہ دونوں انسپکٹر جمشید کے لڑکے ہیں۔۔ یہ معلوم ہونے پر مجھے اپنے ساتھیوں کے ساتھ خود آنا پڑا اور یہاں جو حالات پیش آئے وہ تو آپ جانتے ہی ہیں۔" خان جبار یہ کہہ کر خاموش ہو گیا۔

"بہت خوب، آخر وہ شیشے کا بکس ہے کہاں۔ ابھی تک جس چیز کے لیے اتنا بڑا ہنگامہ ہوا ہے، وہ کہیں نظر نہیں آئی۔ میں حیران ہوں تمہارے بیٹوں نے اسے کہاں چھپایا ہے۔" آئی جی صاحب انسپکٹر جمشید سے بولے۔

"میں خود بھی حیران ہوں۔" وہ مسکرائے۔

"شیشے کا بکس اسی کمرے میں ہے۔" محمود نے مسکرا کر کہا۔

"کیا؟" شوکت اور تنویر کے منہ سے حیرت کی وجہ سے نکلا۔

"ہاں، اسی کمرے میں موجود ہے۔"

"بالکل غلط، ہم نے کمرے کا چپّا چپّا چھان مارا۔"

"ایک بار اور کوشش کرو تو بھی تمہیں نہیں ملے گا۔"

"بھئی بہت خوب، یہ ہوئی نا بات۔" آئی جی صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

"اور میرا خیال ہے کہ فاروق اور فرزانہ کے علاوہ اسے کوئی بھی نہیں ڈھونڈ سکتا۔" محمود نے کہا۔

"تم ہمیں مقابلے کی دعوت دے رہے ہو؟" آئی جی صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔

"جی نہیں تو" محمود نے معصومیت سے کہا۔

سب ہنس پڑے۔

"ٹھہریے، میں ابھی شیشے کا بکس نکالے دیتا ہوں" محمود اپنی جگہ سے آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

"ٹھہرو" آئی جی صاحب نے کہا۔ سب سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگے۔

"بھئی، مجھے لطف آرہا ہے۔ کیوں نہ ہم سب مل کر ایک کوشش کر دیکھیں" آئی جی صاحب بولے۔

"کیا مطلب؟" کئی آوازیں ابھریں۔

"مطلب یہ کہ ہم سب مل کر شیشے کا بکس تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

سب کو یہ تجویز عجیب سی لگی، بچگانہ سی، لیکن کسی نے بھی اسے ناگوار محسوس نہیں کیا، بلکہ یہ بات پر لطف محسوس ہوئی۔

"ٹھیک ہے" سب نے یک زبان ہو کر کہا اور محمود مسکرانے لگا۔

محمود، فاروق اور فرزانہ ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ باقی تمام لوگ شیشے کا بکس تلاش کرنے لگے۔ نقاب پوش اور اس کے ساتھی ہتھکڑیاں پہنے الگ ایک کونے میں کھڑے تھے۔ تقریباً پندرہ منٹ کی مسلسل تلاش کے بعد وہ سب مایوس ہو گئے۔ اس دوران انسپکٹر جمشید نے عملی

طور پر تلاشی لینے میں حصہ نہیں لیا تھا؛ البتہ وہ پورے کمرے کو بغور دیکھتے رہے تھے۔

جب سب مایوس ہو کر واپس اپنی جگہوں پر آ گئے تو آئی جی صاحب بولے:

"حیرت ہے، ہم میں سے کوئی بھی اسے نہیں ڈھونڈ سکا اور انسپکٹر جمشید تم نے تو ہمارا ساتھ ہی نہیں دیا۔"

"جی میں دوسرے طریقے سے تلاش کر رہا تھا۔"

"اچھا بھئی میں یقین سے کہہ سکتا ہوں، تمہارے بیٹوں نے مجرموں کو ہی نہیں، ہمیں بھی دھوکے میں رکھا ہے۔ وہ شیشے کا بکس اس کمرے میں نہیں ہو سکتا۔"

"وہ اسی کمرے میں ہے" انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

"کیا؟ وہ اس کمرے میں ہے ۔۔۔ ناممکن"

محمود اپنے والد کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"وہ اسی کمرے میں ہے" وہ ایک بار پھر مسکرائے اور گتے کے ڈبے کی طرف بڑھے۔ یہ وہی پھنیر سانپ والا ڈبا تھا، جسے شوکت نے ڈر کر پھینک دیا تھا اور محمود نے اسے دبوچ لیا تھا۔

"وہ اس میں ہے" انسپکٹر جمشید بولے۔

محمود نے حیران ہو کر اپنے والد کو دیکھا۔

"اس ڈبے میں ہرگز نہیں ۔۔۔ میں اسے دیکھ چکا ہوں" ایک

آفیسر نے کہا۔

"آپ دیکھ رہے ہیں، یہ گتے کا ایک چوکور ڈبا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے سب کو ڈبا دکھاتے ہوئے کہا: "اور اس ڈبے کے بیچوں بیچ گتے کی دیواروں کی ہی ایک میز سی بنائی گئی ہے، جس پر سانپ بیٹھا ہے۔ اب اگر اس میز کی ایک دیوار کو جو کہ پنوں سے جوڑی گئی ہے، اکھاڑ کر اس کے اندر شیشے کا بکس رکھ دیا جائے اور گتے کی دیوار کو دوبارا پنوں سے جوڑ دیا جائے تو کسی کے فرشتوں کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ اس معمولی سے ڈبے میں اتنی بڑی اہمیت والی چیز ہو سکتی ہے۔ کمرے میں تلاشی لینے والے تقریباً سبھی لوگوں نے اس ڈبے کو بھی دیکھا تھا، لیکن کسی نے اسے کوئی اہمیت نہیں دی۔ یہی مجرموں نے بھی کیا ہوگا، لیکن میں ایک طرف کھڑا بغور ہر چیز کو دیکھ رہا تھا۔"

"آخر آپ نے کیسے اندازہ لگا لیا کہ بکس اس میں ہے۔" بیگم جمشید نے پوچھا۔

"محمود کی غلطی سے۔" انسپکٹر جمشید نے کہا۔

"میری غلطی سے؟" محمود چونکا۔

"ہاں، جب بھی کوئی گتے کے ڈبے کی طرف بڑھتا تھا، تمہاری آنکھوں میں بے چینی کی جھلک دکھائی دیتی تھی اور میں نے اس جھلک کو ہر بار صاف دیکھا تھا — دراصل میں ایک طرف کھڑا اسی

طرح تلاشی لے رہا تھا کہ یہ لوگ کس چیز کی طرف بڑھتے ہیں اور تم کب بے چین ہوتے ہو۔"

"بھئی آخر ہو نا انہی کے باپ — لیکن ہمیں تو یقین اسی وقت آئے گا جب شیشے کا بکس اس میں سے نکلے گا۔"

"لو محمود، تم خود ہی نکال دو۔" انسپکٹر جمشید نے محمود سے کہا۔

محمود نے گتے کا ڈبا لیا اور گتے کی دیوار اکھاڑنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے شیشے کا بکس اس کی ہتھیلی پر رکھا تھا اور وہ سب اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے —

"یہ بکس تو کہیں سے بھی نظر نہیں آتا۔" کسی نے کہا۔

"یہی تو اس کی خوبی ہے۔" آئی جی صاحب بولے۔

"اب سب لوگ اطمینان سے بیٹھ جائیں۔ میرا خیال ہے، ڈرائنگ روم میں چلتے ہیں۔" ڈی آئی جی صاحب نے تجویز پیش کی۔

"یہ ٹھیک ہے۔ انسپکٹر اکرام، تم یوں کرو کہ ان سب کو حفاظت سے پولیس سٹیشن لے جاؤ۔ سٹین گن بھی ساتھ لے جاؤ۔ اور اگر ان میں سے کوئی فرار ہونے کی کوشش کرے تو اسے بھون دینا۔" انسپکٹر جمشید نے اپنے ماتحت کو ہدایات دیں —

"ابا جان، رحیم کا کیا بنا۔ ان لوگوں نے یہ نہیں بتایا۔" فاروق بولا۔

"وہ سول ہسپتال میں ہے۔" شوکت نے بتایا۔

"اور مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے" محمود کو اچانک یاد آگیا۔

"اوہ ہاں، اکرام تم ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے مشرقی پہاڑیوں کے پیچھے کا تمام علاقہ گھیرے میں لے لو اور دشمن ملک کے ان تین جاسوسوں کو گرفتار کر لو۔ دیکھو، ان کی گرفتاری بہت ضروری ہے۔ وہ فرار نہ ہونے پائیں۔ کوشش یہی کرنی ہے کہ انہیں زندہ گرفتار کیا جائے۔ ان سے ہم بہت سی معلومات حاصل کریں گے۔"

"جی بہتر۔ آپ مطمئن رہیں۔ میں انہیں انشاءاللہ زندہ گرفتار کروں گا۔" سب انسپکٹر اکرام نے کہا اور وہ قیدیوں کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔

اس کے بعد وہ سب ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔

بکس کھلتا ہے

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں نیند کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم میں کرسیوں اور صوفوں پر بیٹھنے کے بعد آئی جی صاحب بولے:

"اب مسئلہ ہے اس بکس کو کھولنے کا۔"

"لائیے، میں کھولے دیتا ہوں۔" ایک آفیسر نے کہا۔

"لیکن احتیاط سے۔ اسے جھٹکا نہ لگے، ورنہ یہ پھٹ جائے گا اور فارمولا ضائع ہو جائے گا۔" آئی جی صاحب بولے۔

آفیسر نے شیشے کا بکس لے لیا۔ اسے چاروں طرف سے دیکھا۔ اس میں کوئی درز نہیں تھی۔ کوئی بٹن وغیرہ نہیں تھا۔ کوئی سوراخ نہیں تھا۔ انہوں نے اسے ہر ہر طرح سے دبا کر دیکھا، لیکن بکس کسی طرح بھی نہ کھلا۔

"کمال ہے۔ اس میں کوئی بھی درز وغیرہ نہیں ہے۔ نہ ہی بکس کا کوئی ڈھکنا نظر آتا ہے، جسے اٹھایا جائے۔"

"یہی تو کاریگری ہے۔"

"کیوں نہ اسے سائنسدانوں کے حوالے کر دیں۔ وہ خود ہی کسی طرح کھول لیں گے۔"

"نہیں، آخر اسے کھولنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ موجود ہے، ورنہ پروفیسر رشدی اس فارمولے کو اس میں بند ہی کیوں کرتے۔"

"لائیے، میں کوشش کر دیکھتا ہوں۔" ایک اور آفیسر نے کہا۔ شیشے کا بکس انہیں دے دیا گیا۔

انہوں نے بھی اپنی سی کوشش کر کے دیکھ لی، لیکن شیشے کا بکس نہ کھلا — اس کے بعد تو ہر ایک نے ہی باری باری کوشش کر ڈالی۔ یہاں تک کہ سب مایوس ہو گئے — سب آفیسروں کے بعد انسپکٹر جمشید کی باری آئی۔

انہوں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا، پھر ایک پن لے کر اس پر ہر طرف پھیرتے رہے، لیکن کچھ نہ بنا۔

"آپ میں سے کسی کے پاس لائٹر ہو گا۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں، لیجیے۔" ایک آفیسر نے انہیں لائٹر دیا — سب انسپکٹر جمشید کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

انسپکٹر جمشید نے لائٹر جلایا اور شیشے کے بکس کو چاروں طرف آنچ دینے لگے۔

"کہیں اس طرح یہ ضائع نہ ہو جائے۔" ڈی آئی جی بولے —

"اب تک کی کوششوں کا نتیجہ صفر ہی نکلا ہے۔ ہلکی سی آنچ سے شیشے کو نقصان پہنچنے کا کوئی خطرہ نہیں — ویسے بھی پروفیسر رشدی نے صرف جھٹکا لگنے پر ضائع ہونے کا امکان ظاہر کیا تھا۔ اگر حرارت سے نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا تو وہ ضرور ہمیں خبردار کرتے۔"

"بات تو یہ بھی ٹھیک ہے، لیکن نہ جانے کیوں میرا دل دھڑک رہا ہے۔" ڈی آئی جی صاحب بولے۔

"بے فکر رہیں — اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ یہ اسی طرح کھلے گا۔"

وہ شیشے کے بکس کے چاروں طرف آنچ دیتے رہے۔ یہ عمل تقریباً پندرہ منٹ تک جاری رہا اور دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اب انسپکٹر جمشید کے چہرے پر بھی مایوسی تھی — آخر تنگ آ کر انہوں نے شیشے کے بکس کو میز پر رکھ دیا۔

"اسے سائنس دانوں کے حوالے ہی کرنا ہو گا۔" آئی جی بولے۔

"ہاں، اب تو ہم سب ہی اسے کھولنے کی کوشش کر چکے ہیں۔" انسپکٹر جمشید بولے۔

"ابھی ہم تینوں رہتے ہیں ابا جان۔" محمود بول اٹھا — وہ سب اس کی آواز سن کر چونک اٹھے۔

"واقعی، اس کارنامے کے اصل ہیرو تو یہ تینوں ہیں اور

ایک بار پھر فرزانہ نے بیگم شیرازی کو جگایا — ان کی ابھی ابھی آنکھ لگی تھی —

"اب کیا ہے": انہوں نے فرزانہ کو دیکھ کر پیار سے پوچھا۔

"جب مجرموں کا ساتھی یہاں دیکھنے آیا تھا تو کیا آپ جاگ رہی تھیں —" فرزانہ کو اچانک یاد آیا کہ اس کے جانے کے بعد مجرموں نے ایک آدمی اس کی تلاش میں شیرازی صاحب کے گھر بھیجا تھا —

"میں جاگ رہی تھی، لیکن چھپی ہوئی تھی"

"ہوں، یہ بھی اچھا ہوا — آپ کے ہاں میں نے ایک بار خوردبین دیکھی تھی"

"ہاں، کیوں کیا بات ہے؟"

"ذرا ابا جان کو اس کی ضرورت ہے"

"کیا مجرم پکڑے جا چکے ہیں؟"

"ہاں —"

"اور شیشے کا وہ بکس؟"

"اسی کو کھولنے کے لیے خوردبین کی ضرورت ہے —"

"کیا شیشے کا بکس خوردبین سے کھلے گا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے"

"خوردبین سے اسے بغور دیکھا جائے گا"

"اچھا، میں ابھی لا کر دیتی ہوں" بیگم شیرازی اٹھ کر کمرے

ہم نے انہیں بالکل ہی بھلا دیا — تو کیا تم بھی اسے کھولنے کی کوشش کرو گے" ڈی آئی جی صاحب نے کہا۔

"اگر آپ اجازت دیں —"

"ہماری طرف سے اجازت ہے" آئی جی صاحب نے کہا۔

اجازت ملنے پر سب سے پہلے محمود نے بکس کو اٹھا کر بغور دیکھا، پھر اس نے یہ فاروق کی طرف بڑھا دیا — فاروق نے غور سے دیکھنے کے بعد فرزانہ کو دے دیا۔ جب تینوں دیکھ چکے تو آپس میں کھسر پھسر کرنے بیٹھ گئے۔ آخر محمود نے سر اوپر اٹھایا اور کہنے لگا:

"ہم تینوں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اسے خوردبین سے دیکھا جائے۔ ضرور اس کے اندر کوئی سوراخ موجود ہے جو ہمیں نظر نہیں آیا"

محمود کی بات سن کر سب دنگ رہ گئے۔

"واقعی، یہ خیال ہم میں سے کسی کو نہیں آیا۔ انسپکٹر کیا تمہارے ہاں خوردبین ہو گی؟" آئی جی صاحب نے پوچھا۔

"جی نہیں" وہ بولے۔

"تو پھر پہلے ایک خوردبین کا بندوبست کرنا چاہیے —"

"یہ شاید شیرازی صاحب کے ہاں ہے" فرزانہ نے بتایا۔

"بہت خوب، تب تم ہی جا کر لے آؤ"

"جی اچھا —"

سے نکل گئیں۔

جلد ہی فرزانہ خوردبین لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ انسپکٹر جمشید نے خوردبین اس کے ہاتھ سے لے کر میز پر رکھی۔ اس کے شیشے سیٹ کیے اور اس میں سے شیشے کے کیس کو غور سے دیکھنے لگے۔ کافی دیر تک وہ اس کام میں مصروف رہے۔ باقی تمام لوگوں کے دل دھڑک رہے تھے۔ آخر کار وہ چلائے:

"وہ مارا۔ اس میں ایک سوراخ موجود ہے۔ ذرا ایک پن دیں۔"

انہیں ایک پن دے دی گئی۔ پن انہوں نے سوراخ میں داخل کرنا چاہی۔ مگر سوراخ بہت باریک تھا۔

"افسوس، یہ پن تو بہت موٹی ہے۔" وہ بولے۔

"اس سے باریک پن کہاں سے لائیں۔" آئی جی صاحب بولے۔

"اس وقت تو شاید نہ مل سکے گی۔" کوئی صاحب بولے۔

"اسی پن کو باریک کیوں نہ کیا جائے۔" محمود نے تجویز پیش کی۔

"ہاں، میرے پاس ریتی موجود ہے۔" فاروق نے کہا۔

"تو لاؤ۔"

پن کو ریتی سے باریک کیا گیا۔ جب وہ بہت باریک ہوگئی تو انسپکٹر جمشید نے خوردبین میں دیکھتے ہوئے پن سوراخ کے منہ پر رکھ دی۔ پن اب بھی اندر نہیں جا سکی، لیکن سوراخ کے

منہ پر اٹک ضرور گئی۔ انسپکٹر جمشید نے ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

"کھٹاک۔" کمرے کے گہرے سکوت میں ہلکی سی آواز ابھری۔ پھر ان سب کے منہ حیرت سے کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بالکل کسی صندوق کی طرح شیشے کے کیس کے اوپر ایک ڈھکنا اٹھا ہوا تھا اور اس کے اندر ایک چکنا کاغذ تہہ کیا ہوا رکھا تھا۔

کاغذ کو کیس میں سے نکال لیا گیا۔ اسے کھولا گیا، لیکن کاغذ کی تحریر کسی کے پلے نہ پڑی۔

"یہ کوئی سائنس دان ہی پڑھ سکے گا۔ ہم اپنے حصے کا کام کر چکے ہیں۔" آئی جی صاحب بولے۔

"جی ہاں، میرا خیال ہے کہ یہ پروفیسر داؤد کے حوالے کر دیا جائے۔"

"ٹھیک ہے، وہ بھی پروفیسر رشدی کے پائے کے سائنس دان ہیں۔"

"اور ساتھ ہی ان کی کوٹھی کے گرد مسلح پہرہ لگا دیا جائے۔ کہیں دشمن ملک کے جاسوس پھر اسے حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں۔" انسپکٹر جمشید نے تجویز پیش کی۔

"ہاں، یہ بھی بہت ضروری ہے۔"

"تو اب چلنا چاہیے۔ یہ مہم اب مکمل ہو چکی ہے۔" ڈی آئی جی صاحب نے مسکرا کر کہا۔

"انسپکٹر جمشید، مجھے بہت افسوس ہے کہ میں نے تمہاری شان

میں کچھ نازیبا الفاظ کہے تھے۔"

"اوہ کوئی بات نہیں سر، یہ سب غلط فہمی کی بنا پر ہوا۔"

"ہاں، بالکل۔"

عین اسی وقت باہر جیپ کی آواز سنائی دی۔

"یہ اس وقت کون آگیا؟" آئی جی صاحب بولے۔

"اکرام ہوگا۔ ایک بجنے والا ہے۔ وہی مشرقی پہاڑیوں سے آیا ہوگا۔" انسپکٹر جمشید نے خیال ظاہر کیا۔ ان کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ آنے والا سب انسپکٹر اکرام ہی تھا۔

"کیوں انسپکٹر، کیا رہا؟"

"تینوں کو زندہ گرفتار کر لیا گیا ہے سر۔"

"وری گڈ۔"

"اچھا بھئی، اب ہم چلتے ہیں۔ تمہارے بچوں کا یہ کارنامہ سنہرے لفظوں میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ صبح کے تمام اخبارات میں شائع ہوگا۔ میں ابھی تمام اخبارات کو فون کیے دیتا ہوں۔" آئی جی صاحب نے کہا۔

"لیکن آپ ان کو ساری تفصیل کس طرح بتائیں گے۔ یہ کام رہنے دیں۔ کل اخبار والے خود ہی یہاں آکر ساری کہانی نوٹ کریں گے اور اس طرح دوسرے دن کے اخبارات میں شائع ہوتی رہے گی یہ کہانی — آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔" انسپکٹر جمشید

نے کہا۔

دوسرے دن کے تمام اخبارات نے اس واقعے کو موٹی موٹی سرخیوں سے پہلے صفحے پر شائع کیا تھا اور اس طرح میدان ایک بار پھر محمود، فاروق اور فرزانہ کے ہاتھ رہا۔

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۱۰

نوٹ بک

مصنف : اشتیاق احمد

- انسپکٹر جمشید نے انہیں ایک عجیب و غریب حکم دیا۔
- شمالی پہاڑیوں پر ایک عجیب ہنگامہ۔
- اس ہنگامے میں محمود، فاروق اور فرزانہ بھی شامل ہو گئے۔
- اس سارے ہنگامے کی تہ میں کیا راز کام کر رہا تھا۔
- ایک ایسا راز، جو بہت خوف ناک تھا۔ آخر میں آپ اچھل پڑیں گے۔

قیمت : ۶ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک

محمود، فاروق، فرزانہ اور انسپکٹر جمشید سیریز ۱۱۱

وادیٔ مرجان

مصنف : اشتیاق احمد

- محمود، فاروق اور فرزانہ نے اس بار ایک نیا پروگرام بنایا۔
- اس پروگرام میں خان رحمان اور پروفیسر داؤد کو بھی شامل کیا گیا۔
- یہ پروگرام انہیں وادیٔ مرجان لے گیا۔
- وادیٔ مرجان میں کیا ہو رہا تھا۔ انہیں قدم قدم پر جھٹکے لگے۔
- اور آخر میں ایک خوف ناک خطرہ ان کے سر پر آ گیا۔

لیکن آپ اسے ایک ناول نہیں کہہ سکتے۔

قیمت : چھ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک :

آفتاب، آصف، فرحت اور انسپکٹر کامران مرزا سیریز ۳۷

سرخ تحریر

— مصنف : اشتیاق احمد —

- بارش کے طوفان نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔
- ایسے میں سڑک کے کنارے انہیں ایک آدمی ملا —
- اس کے الفاظ عجیب وغریب تھے۔
- طوفان نے انہیں کن حالات میں الجھایا۔
- دو حویلیوں کی کہانی، جو ایک جیسی تھیں —

قیمت : چھ روپے

آئندہ ناول کی ایک جھلک :

شوکی سیریز ۱۹

بند محل

— مصنف : اشتیاق احمد —

- شوکی برادرز کے پاس ایک پراسرار آدمی کی آمد —
- وہ شخص بار بار ایک ہی خواب دیکھ رہا تھا۔
- اس کا خواب سن کر شوکی برادرز کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی —
- جواب کیا تھا — خواب کی تہہ میں کیا راز کام کر رہا تھا۔
- ایک حیرت بھری کہانی —

قیمت : چھ روپے

ہمیں شکایت ہے

ندیم غوری بلاک ۵-۱۱۵ کوارٹر ۱۱ اورنگ آباد ناظم آباد، کراچی ۱۶ سے لکھتے ہیں۔ اس دفعہ پھر ناولوں کی کٹنگ درست نہیں تھی۔ آپ کے ناولوں کے پیچھے جو الزامات شائع ہوتے ہیں۔ ان میں بہت سے الزامات ایسے ہیں، جن پر عمل کرنے سے ناولوں کا معیار گر جائے گا۔۔ مثلاً الزامات یہ ہیں:

آپ ناولوں میں دعوتیں بہت دکھاتے ہیں۔ انسپکٹر صاحبان کی بیگمات ان کے دوستوں سے پردہ نہیں کرتیں۔ اپنے کرداروں کو کوٹ اور ٹائی پہناتے ہیں، جبکہ نماز ٹائی پہن کر مکروہ ہے۔ آپ کے کردار بھرپور قہقہہ لگاتے ہیں۔ میرے خیال میں اس قسم کی باتوں پر اعتراض نہیں کرنا چاہیے؛ گویا آپ نے ان الزامات کو دور کرنے کی کوشش کی تو ناولوں کا معیار گر جائے گا۔ ناولوں میں سے شوخی اور طراری غائب ہو جائے گی۔ غور فرمائیں۔

احسان عبدالرحمٰن بھٹہ۔ ۳۴۴ تسلیم بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور سے لکھتے ہیں۔ مجھے آپ سے شکایت ہے کہ یوں تو آپ بہت مذہبی پرہیزگار

بنتے ہیں اور اپنے کرداروں کو بھی مذہبی دکھاتے ہیں، لیکن آپ کے ایک کردار خان رحمان اپنے ملازم کو کان پکڑانے کی سزا دیتے ہیں۔ جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خادموں سے بہت اچھا سلوک کیا۔

رضوان زیدی۔ سٹی لائٹ ٹاؤن، گوجرانوالا سے لکھتے ہیں:

آپ سے شکایت ہے کہ آپ اپنے ناولوں میں جج کا ذکر کرتے ہیں؛ حالانکہ اسلامی قانون کے مطابق قاضی عدالتیں اب کئی شہروں میں قائم کی جا چکی ہیں۔ آپ کیوں جج کی بجائے قاضی کو اپنے ناولوں میں نہیں لاتے۔

ج: ابھی مکمل طور پر ایسا نہیں ہوا۔

سید طاہر علی ۱۱/۱۱ بلال گنج ٹی بی ہسپتال، لاہور سے لکھتے ہیں:

آپ میرے خطوط کے جواب بڑی سرد مہری سے دیتے ہیں۔ دو تین خطوط کے جواب میں صرف ایک خط ارسال کرتے ہیں۔ کیا آپ صرف ان خطوط کا جواب دیتے ہیں، جن میں آپ کی تعریف اور خوشامد کے الفاظ درج ہوں۔

ج: شائع ہونے والے خط پڑھ لیجیے۔

ثمینہ ناز۔ بازار جہانگیر پورہ، پشاور سے لکھتی ہیں:۔
اشتیاق بھیا، مجھے بھی آپ سے شکایت ہے۔ وہ یہ کہ آپ نے ابھی تک محمود، فاروق اور فرزانہ کو سکول میں بیٹھے نہیں دکھایا، نہ کوئی کیس سکول سے شروع کیا۔
ج: آپ کی شکایت دور کر دی جائے گی انشاءاللہ۔

خرم شہزاد۔ ایبن منیشن، گوجرانوالا سے لکھتے ہیں:
ہمیں آپ سے شکایت ہے کہ آپ نے اب تک محمود، فاروق اور فرزانہ کے بہت سے ایسے ناول لکھے ہیں، جن میں انہوں نے انسپکٹر جمشید کی مدد کے بغیر کیس حل کیا۔ مثلاً خونی پروگرام، سوزانی درندہ وغیرہ، لیکن آفتاب، آصف اور فرحت کا کوئی ایسا ناول نہیں لکھا، جس میں انہوں نے انسپکٹر کامران مرزا کے بغیر کیس حل کیا ہو۔ امید ہے یہ شکایت جلد دور کریں گے۔
ج: میرا خیال ہے ایک دو ناول ان کے بھی ایسے لکھ چکا ہوں، لیکن یاد نہیں آرہا کہ کون سے ۔۔ قارئین شاید اس کا جواب دے سکیں۔۔